پار پرے

ناول

جوگندر پال

انشاء پبلی کیشنز

25B, Zakaria Street, Kolkata - 700073
Phone : 22354616
E-mail : inshapublications@vsnl.net

ISBN : 81-86346-16-3

Paar Pare

Urdu Novel *by* Joginder Paul

پار پرے (ناول)

مصنف : جوگندر پال

سالِ اشاعت : ۲۰۰۴ء

قیمت : -/150 روپے

خاکے : ساگر۔ کمل چکرورتی۔ پنکھل۔

کمپوزنگ اور سرورق : انشاء گرافکس

6A, Kanai Seal Street
Kolkata - 700073

پبلشر۔ پرنٹر : انشاء پبلی کیشنز

25B, Zakaria Street
Kolkata - 700073
Phone : 2235-4616



اپنے دونوں ناراض بیٹوں کے نام،
خدا انہیں سلامت رکھے۔

جوگندر پال


کتاب ۱



(۱)

پُتلے والا چوک پورٹ بلیئر کے پرانے شہر میں واقع ہے۔ پہلے یہاں کسی انگریز بہادر کا پُتلا ہوا کرتا تھا، مگر ملک کی آزادی پر اُسے اتار کر جواہر لعل نہرو کو وہاں نصب کر دیا گیا۔ مرکزی حکومت کا ایک سنیئر وزیر اس پتلے کی افتتاحیہ رسم ادا کرنے دلّی سے یہاں آیا تھا اور اپنی تقریر میں اس نے سزا یافتہ مقامی مجسمہ ساز کی تعریف کرتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی تھی کہ مجھے اس مجسمہ میں سے نہرو کی روح جھانکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

''تمہاری کیوں نہیں؟'' کسی نے مجسمہ ساز سے پوچھ لیا تھا۔

''اس لئے کہ صرف اُنہی روحوں کو کھٹکا لگا رہتا ہے جو اپنے کئے دھرے کی سزا سے بچ نکلی ہوں۔''

''ہاں، تم تو اپنی سزا بھگت چکے ہو——''

مگر بابا لالو تو ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا، تم کہتے ہو بھائی تو مانے لیتا ہوں کہ یہ پُتلا نہرو کا ہے، پَر میں تو اسے جب بھی دیکھتا ہوں یہی لگتا ہے اپنا وہی انگریز بہادر کھڑا ہے۔

''حیرت ہے بابا، کیا تم نے نہرو کی تصویر بھی نہیں دیکھ رکھی؟''

''کیسے نہیں دیکھ رکھی، بھائی؟ سارے ملک میں ہر پنواڑی نے اسے فلم ایکٹروں کے جھرمٹ میں سجا رکھا ہوتا تھا۔''

''پھر بابا——''

''پھر کیا؟ اُسی کی پہچان میں تو بگاڑ پیدا ہوتا ہے جو صرف تصویروں میں ہی دِکھنے میں آئے——''

''ہاں، اپنی ماں سے بچھڑے مجھے چالیس سال سے بھی اوپر ہو لئے ہیں۔'' کالے پانی کا ایک اور پرانا بندی بول پڑا۔ ''اس ساری مدت میں، میں نے ماں کا کوئی چتر بھی نہیں دیکھا۔ اس کی لیچڑ آنکھوں سے پانی کی دھار پھوٹ آئی، پتہ نہیں کسی بیماری سے، یا رونے سے——

''اب تک تو وہ دو تین بار مر کھپ چکی ہوگی، مگر میں اسے بکری کی جُون میں بھی دیکھ لوں تو جھٹ پہچان لوں۔''

پُتلے والے چوک کے دائیں پہلو کی ڈھلان پر ایک راستہ بے خیالی میں ٹھوکر کھا کر نیچے ہی لڑھکتے ہوئے قصوں والی گلی میں جا گرتا ہے۔ بابو لالو اسی گلی میں رہتا تھا۔ وہ دائیں طرف ڈھائی منزلہ پانچواں مکان—— کالے پانی کی سزا ملنے پر پہلے چند ماہ تو اسے سیلولر جیل میں رکھا گیا اور پھر حسب دستور ڈیڑھ سال کیلئے کسی اور جیل میں بھیج دیا گیا، جہاں سے معینہ مدت کے اختتام پر وہ نیم آزاد قیدی کا درجہ پا کر کھلی بیرکوں میں آ گیا۔ ان دنوں یہاں اتنے زیادہ قیدی جمع ہو گئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیرکوں میں نہیں رہ رہے بلکہ بیرکیں ہی ان میں پاؤں پسار کر ٹک گئی ہیں۔ ایسے میں چیف کمشنر نے اسپیشل ہنگامی آرڈر نافذ کر دیا کہ بیرکوں کے امن پسند قیدیوں کو عام قاعدے سے قطع نظر شہر میں آزاد رہائش کے لئے فوراً چھوڑ دیا جائے، چنانچہ بابا لالو بھی باہر آ گیا مگر باہر آ کے بھی اُسے یہی مسئلہ درپیش تھا کہ کسی طرح جلد از جلد زندگی کا کوئی حصار میسر آ جائے۔ ہاں، اور کیا؟ گھر ہی تو۔

نہیں، کالے پانی کی سزا ملنے سے پیشتر بھی بابا لالو کا کہیں بھی اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ جو لڑکا اپنے ماں باپ، بھائی بہن، کسی بھی اپنے کو نہ جانتا ہو اس کا گھر کہاں ہوتا ہے؟ لوگ کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ یا کم سے کم ماں کو نہ پہچانتا ہو اُسے ہم آدم کی اولاد میں کیوں کر شامل کر سکتے ہیں۔ مگر بابا کو کیا پڑی تھی کہ وہ اپنے آپ کو آدم کی اولاد ثابت کرنے کی تدبیر کرتا۔ وہ تو یوں ہوا کہ اوپر بادلوں میں اڑتے اڑتے کسی آوارہ فرشتے کی ایک حور سے مڈبھیڑ ہوگئی اور ان کے اختلاط پر بابا بالہ حور کی کوکھ میں ٹھہر گیا —— نہیں، ٹھہر کیا گیا، اپنے فوق الفطرت والدین کی اطلاع کے بغیر اُسی دم پیدا ہو کر کسی بادل میں جا اٹکا۔

بابا کی یہی مشکل تھی کہ اپنی ہر کہانی وہ ہندسوں کی بجائے استعاروں میں ہی بیان کرتا، اب آگے کی بھی اُسی کی زبان میں سن لیجئے:

پھر رم جھم کا سماں بندھا تو میں بوندوں میں گھرا چپکے سے کسی جنگل میں ٹپک آیا —— پھر؟ —— ''پھر کیا؟ —— جنگل میں کسی ریچھنی نے مجھے اپنا دودھ پلا پلا کر قدموں پر کھڑا کر دیا اور پھر ریچھنی نے تو حسبِ خُو اپنی راہ ہو لی اور میں کسی بھیڑیے کی دُم پکڑ کر کھیلتے کھیلتے جنگل سے بستی میں آ نکلا ——''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا؟''

''پر ہو تو گیا بھائی، نہ ہوتا تو سیدھا بستی میں کیسے آ پہنچتا؟ ——''

''یہ قصہ چھوڑو بابا۔ یہ بتاؤ، یہاں کالے پانی کیسے آ پہنچے؟''

''اُسی طرف تو آ رہا ہوں —— '' بابا لالو اپنی داستان سناتے ہوئے اسے از سرِ نو جینا شروع کر دیتا۔ اُس بستی میں ایک بوڑھا اور تنہا اسکول ماسٹر تھا، بابو اللہ دتا، جو اپنے منہ میں نوالہ بھی کچھ اس مانند ڈالتا جیسے اسکول کے بچوں کو منہ میں نوالہ ڈالنے کا سبق دے رہا ہو —— یوں —— ں! —— بابو کو باپ بننے کی بڑی تمنا تھی، مگر بیوی کے بغیر اس کی یہ تمنا کیوں کر بر آتی؟ اُسی نے مجھے اپنے گھر میں ڈال لیا —— ہاں، ڈالا تو بیٹا بنا کے ہی، مگر کیا بتاؤں؟ بے چارہ اپنی جنسی بھوک سے اتنا تنگ تھا کہ اگر



میں اُس کا سچ مچ کا بیٹا بھی ہوتا تو وہ میرے ساتھ وہی کرتا جو کیا کرتا تھا——"

"کیا کیا کرتا تھا، بابا؟"

"ارے بھائی، جو کرتا اُس کے سوا اور کیا کرتا؟ بھوکے کو روٹی نہ ملے تو وہ اپنے کپڑے ہی پھاڑ پھاڑ کر کھانا شروع کر دیتا ہے —— ہاں، میں —— مجھے کیا پتہ، وہ مجھ سے کیا کر رہا ہے؟ میں تو نہال تھا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے بنائی کچی روٹیاں اور باسی سالن کھلاتا ہے۔ میرے دن بڑے مزے سے گزر رہے تھے اور میں اسی مانند آٹھویں —— نہیں، نویں جماعت تک آن پہنچا تھا——"

"تم ابھی چھوٹے تھے بابا، پر سمجھتے تو سب کچھ ہو گے، پھر بھی——"

"سب کچھ سمجھتا تھا بھائی، سمجھ میں تو تمہارے نہیں آ رہا۔ جن بچوں کا کوئی آگا پیچھا نہ ہو وہ پیدا ہوتے ہی اپنے پیروں پر چل کر —— ہنسو نہیں، بھائی، میں نے اپنی ان دو آنکھوں سے دیکھا ہے —— واقعی اپنے پیروں پر چل کر سب سے پہلے پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا بھائی، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ——"

"پہلے اپنی یہ کہانی تو پوری کر لو بابا، تم ماسٹر اللہ دِتا کے ساتھ رہ رہے تھے، پھر؟——"

"ہاں، وہ! —— میں ابھی اپنی نویں جماعت بھی پاس نہیں کر پایا تھا کہ میرا کنوارہ اور بڈھا باپ بابو اللہ دتا اچانک چل بسا، خدا اُسے معاف کرے، جب میں اس سے اردو اور فارسی پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تھا تو وہ مجھے ہدایت کرتا، چلو، اٹھو، اب چارپائی پر اوندھے لیٹ جاؤ——"

"بابا، بابو اللہ دتا کے بعد تم —— کیا نام تھا اس کا؟ —— ستیہ وتی کے ہتھے کیسے چڑھے؟——"

"ٹوکو نہیں، بابا کو آپ ہی سنانے دو——"

"ستیہ وتی ہمارے اسکول کی منیجر تھی، وہ مجھ پر ترس کھا کر مجھے اپنے گھر لے آئی۔ اس طرح میرا اسکول جانا بھی چھوٹا اور میں اُس کے گھر کا کام کاج بھی دیکھ لیتا

اور ــــــ اور ــــــ ارے بھئی، کیوں مجھ سے گڑے مُردے اکھڑواتے رہتے ہو۔''

''نہیں آگے کی بھی سناؤ۔''

''جو گزر گئی وہ تو پیچھے رہ گئی، پر سنو۔ ستیہ وتی بابو اللہ دِتا سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ سلانے کے لئے اپنے بیڈروم کا رخ کرنے کا حکم دیتی، اُس کا بوڑھا شوہر عموماً اپنے بزنس ٹور پر کہیں باہر گیا ہوتا، اور جب نہ گیا ہوتا تو میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑے رہتے۔ اسی طرح میرے ڈھائی تین سال بیت گئے اور پھر ایک رات کیا ہوا کہ میاں بیوی کا جھگڑا طول پکڑ گیا، میں نے کوئی دھیان نہیں دیا، اُس رات کی ڈیوٹی سے چھٹی پا کر میں مزے سے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں مجھے بندوق کی گولی چلنے کی آواز سنائی دی، میری شامت آئی تھی کہ میں دوڑا دوڑا اُن کے کمرے میں جا پہنچا، بس پھر کیا؟ ستیہ وتی کے شوہر کے خون کے الزام میں دھر لیا گیا۔''

''پر خون تو ستیہ وتی نے کیا تھا بابا''

''پر ستیہ وتی کے وکیل کی بحثیں سن کر مجھے بھی یقین آ گیا تھا کہ خونی میں ہی ہوں۔''

''بابا، کیا تم نے جرم کا اقبال کر لیا تھا؟''

''میرے وکیل نے مجھے رائے دی تھی کہ پھانسی سے بچنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔''

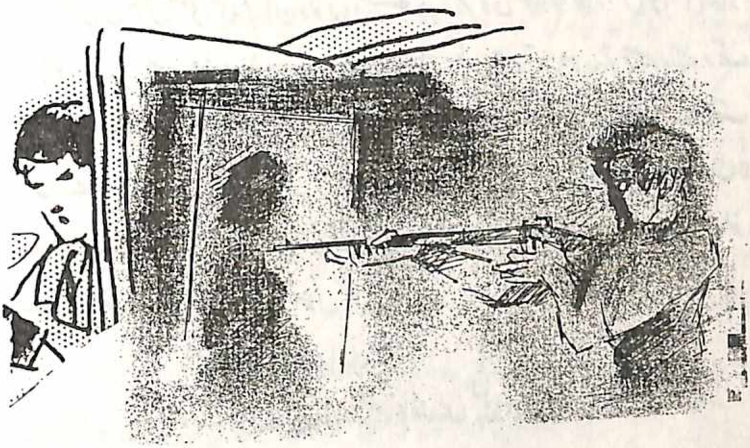
''مگر ــــــ''

''اگر مگر کیا، بھائی؟ جیسے بھی جینا مل جائے، مرنا کیوں؟ میری تو اس خیال سے ہی جان نکلنے لگتی ہے کہ پاؤں کے نیچے سے زمین سرک گئی ہے اور میں گلے سے بندھ کر ہوا میں لٹک گیا ہوں۔''

''آگے کی ساری کہانی ہمیں معلوم ہے بابا ــــــ''

''ہاں میری ساری کہانی کا نچوڑ یہ ہے کہ زمین جتنی بھی چکنی ہو، کسی

طرح گرد نہیں، یا پیر پھسل بھی جائے تو لڑھک کر سیدھا اپنی قصوں والی گلی میں آ پہنچو۔''
قصوں والی گلی میں پہنچنے سے پہلے بھی بابا لالو یہیں قصوں والی گلی کا ہی مکین تھا، اسی لئے وہ پیدائش پر بادلوں سے ٹپک کر جنگل میں آ گرا، ریچھنی کا دودھ پی کر بڑا ہوا اور بھیڑیئے کی پونچھ پکڑ کر بابو اللہ دِتا کے دروازے پر آ پہنچا اور بابو اللہ دِتا بھی نہ رہا تو ستیہ وتی کی خواب گاہ کے راستے یہاں کالے کوسوں اپنے ڈھائی منزلہ گھر!
''اللہ کا شکر ہے!'' سوچ سوچ کر بابا لالو کے منہ میں بابو اللہ دِتا کا تکیہ کلام جھول جاتا۔
یہاں کالے پانی پہنچنے پر لالو کو کچھ عرصہ تو سیلولر جیل میں بیڑیوں میں رکھا گیا، اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُن دنوں اسسٹنٹ جیلر کوئی سٹیونز تھا، جس کی گھنی خاردار مونچھوں تلے پھٹے پھٹے ہونٹوں سے میٹھے بول اس طرح برآمد ہوتے جیسے میلے رنگ کی جھاڑیوں کے جھنڈ سے رنگ برنگے ننھے سے پرندے، جو ٹھوڑی تک ذرا سے جھک کر اُس کے سارے چہرے کو اپنی سجل اڑان میں بھر لیتے۔ اپنی آمد کے دوسرے روز ہی لالو نے اچانک جو اپنا سر سیل کی آہنی سلاخوں کی طرف اٹھایا تو سٹیونز کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے ایک ننھا منا پرندہ اس کے قدموں میں اُڑ آیا۔
''ماں باپ یاڈ آرہاہے؟''
لالو کے پاس رنگین اور چکنے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک ٹافی آن گری۔
''کھانا سکتا!''
''چیں چیں —— '' چ!'' پرندہ اس کے قدموں سے اُڑ کر سر پر آ بیٹھا۔
''ہاں، ہاں، کھانا سکتا؟ ——''
لالو نے ٹافی اٹھا کر اُسے کاغذ سمیت منہ میں ڈال لیا۔
''چیں، چ، چیں ——!''
لالو کے منہ میں مٹھاس گھل رہی تھی اور پرندہ سر پر شاخ بہ شاخ چہچہائے



جا رہا تھا۔

سیٹونز صاحب کی مہربانی سے لالو کی بیڑیاں چند ہی ہفتوں میں کھول دی گئیں۔

''بیڑیاں کھل جانے پر مانو میری سزا پوری ہولی اور میں آزاد ہوگیا——''

اپنی کہانی کا یہ حصہ سناتے ہوئے بابا لالو گویا ریچھنی کا دودھ غٹ غٹ گلے سے نیچے اتار رہا ہوتا——

''کھلے پیر چل چل کر چوپائے بھی اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھنے لگتے ہیں۔''

''اشرف اُل—— کیا مطلب، بابا؟''

بابا مسکرا کر سوچنے لگتا، ان بے چاروں کا کیا دوش؟ اگر انہیں بھی ایک بار بابو اللہ دتا کی چارپائی پر اوندھے لیٹنے کا موقع مل جاتا تو آپ ہی آپ سب کچھ سیکھ جاتے۔ وہ پوچھنے والے کو جلدی جلدی اشرف المخلوقات کا مطلب سمجھا کر پھر اپنی بات کی طرف لوٹ آتا—— ''آزاد قدم ہوکر سب سے پہلے میں نے ایک لمبی دوڑ لگائی اور سانس پھول گئی تو اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ اب پیروں میں کون سی بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، موت تک چلتے ہی جانا ہے۔ آرام سے قدم بہ قدم چل کر بوڑھے ہوں گے۔ سیٹونز صاحب مجھ سے باتیں کرنے کے لئے اکثر مجھے روک لیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے بھی یہی رائے دی کہ ہر کام اگرچہ ہاتھ پیر ہلانے سے ہی پورا ہوتا ہے، مگر سوجھ بوجھ بھی برتنے سے بہتر ہو جاتا ہے۔ میں نے اُن کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کیا اور وہ مجھ سے اتنے خوش ہوئے کہ کم سے کم آزمائشی مدت پوری ہوتے ہی مجھے سیلولر جیل سے بیرکوں میں بھجوا دیا۔''

''یہ وہی سیٹونز صاحب ہیں نا بابا، جنہوں نے خودکشی کر لی تھی؟''

''ہاں، وہی!'' بابا لالو سیٹونز کا پورا چہرہ آنکھوں میں لانے کے لئے ذرا

رک گیا، "بڑا نیک آدمی تھا، قیدیوں کی ڈھارس بندھاتا رہتا تھا۔ اداس کیوں ہونا مانگتا؟ ہم سب لوگ اپنا کیڈ کاٹ رہا ہے، تم کوٹھری میں، میں اپنا بڑن میں —— لو، یہ سگریٹ پینا سکتا! —— " بابا لالو اپنی ٹھنڈی سانس بھر کر سیٹونز صاحب کو اپنے اندر اتار لے گیا ——

"اتنا نیک تھا، معلوم نہیں اتنا دکھی کیوں تھا —— "

"بابا۔ "کسی نے اسے ٹوکا، جب اتنا نیک تھا تو دکھی تو ہوگا ہی۔"

"گلت!" بلند بانگ مہنت جالم سنگھ، بابا لالو کا پرانا ساتھی تھا، میں کھوب جانتا ہوں، لالو، میں نیک دیک نہیں، پھر حسد سے کھیلدے بھی کیاؤں دُکھی رہتا ہوں؟"

بابا لالو نے مہنت کو پیار بھری نظر سے دیکھ کر سوچا کہ جو آدمی اُس کی طرح اپنا ہر کام جپ بول کر کرتا ہے، اُسے کیا پتہ، وہ کتنا نیک ہے!

بابا لالو کے سنگی ساتھیوں کو تو بابا سے اُس کے قصے سننے کا چسکا تھا ہی، مگر بابا کو بھی اپنے قصوں کہانیوں سے منہ خالی کر لینے کا موقع نہ ملتا رہتا تو وہ اپنے بھرے منہ میں روٹی کا ایک لقمہ بھی نہ ٹھونس پاتا۔

"اچھا، یہ بتاؤ بابا، گوراچاچی سے پہلی بار کہاں ملے تھے؟"

"ارے، اتنا بھی نہیں جانتے؟ یہیں بیرکوں میں، اور کہاں؟"

"ہاں جب دونوں نے بیرکوں کی پھکس مدت پوری کر لی تو انہیں باکی کی کید میں بھی بیرکوں میں ہی کام دھندہ مل گیا۔"

"ہاں، بھائی، وہ تو اچھا ہوا مجھے کالے پانی کی سزا مل گئی، ورنہ تمہاری چاچی سے کہاں ملتا؟ اُسے ڈھونڈنے کدھر جاتا؟ میں تو اُس کی شکل وصورت سے بھی ناواقف تھا —— "

نہیں بابا، چاچی کے دھوکے میں تم کسی اور کا ہاتھ بھی جا پکڑتے تو مارا ماری کے بعد تمہیں یہیں بھیج دیا جاتا۔"

''ہاں، بھائی، سنجوگ بڑے بلوان ہوتے ہیں۔ ستیہ وتی کے ساتھ منہ کالا کیا تو چاچی گوراں نصیب ہوئی، بیرکوں میں تو مجھے بہر حال پہنچنا ہی تھا۔''

چاچی گوراں جوان جہاں تھی مگر بیرکوں میں سب چھوٹے بڑے اُسے چاچی کہہ کر بلاتے تھے۔ بابا لالو اُن دنوں پہلے ڈیڑھ سال تو بیرکوں میں پتھر کوٹتا رہا مگر بقیہ سالوں میں اُسے مستقل طور پر بیرکوں کے میس میں ہی باورچی کی ڈیوٹی سونپ دی گئی۔

ایک دفعہ وہ عورتوں کی ایک قطار میں دال بانٹ رہا تھا کہ چاچی کے پیالے میں شاید اُس نے پوری دال نہ انڈیلی۔ بس پھر کیا تھا، چاچی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''جانتے ہو، میں کون ہوں؟''

بابا نے اُسے بڑے دھیان سے دیکھا اور وہ اُسے بھا گئی ——

''تم بتاؤ گی بی بی، تو کیوں نہ جانوں گا''۔

چاچی ذات کی کنجری تھی اور کالے پانی اس لئے آ پہنچی تھی کہ اُس کے کسی گاہک نے اُس کے ساتھ پوری رات بسر کر کے پیسے مار کر چمپت ہو جانا چاہا اور تو تو میں میں کے دوران گوراں نے جو زور سے دھکا دیا تو وہ کوٹھے کے کمزور جنگلے سمیت سڑک پر آ گرا اور گرتے ہی دم توڑ دیا اور وہ بیچاری خون کے مقدمے میں پھنس گئی۔

''بتاؤ نا، بی بی، کون ہو تم؟''

''بتاؤں گی تو پتہ نہیں یہاں کالے پانی سے بھی آگے کہاں جا پہنچو گے'' ۔ چاچی نے بابا کو جواب دیا۔ چپ چاپ بھائی بن کے پوری دال بانٹو اور آگے بڑھو۔''

بابا نے ہنستے ہوئے پوری سے بھی دگنی دال اُس کے پیالے میں ڈال دی —— میں تمہیں بھائی معلوم ہوتا ہوں بی بی؟''

''تو کیا تمہیں اپنا کھسم بنا لوں؟'' چاچی نے ڈھیلا ہو کر بناوٹی غصے سے کہا، ''کوئی ایسی ویسی نہیں، پوری کنجری ہوں، چلو، آگے بڑھو۔''

اُس روز کے بعد بابا لالو کا معمول ہو گیا کہ دال بانٹتے ہوئے چاچی تک

پہنچ کر پہلے تو وہ ذرا سا ہنستا اور پھر اس کے پیالے میں دگنی دال ڈال کر اُسے چور آنکھوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔

اسی طرح کئی دن بیت گئے۔

اور پھر ایک دفعہ شام کے وقت وہ یونہی ذرا باہر گھومنے کو نکلا تو اُسے عقب سے سنائی دیا۔ ''سنو!''

آواز پہچان کر بابا کا دل دھک دھک دھڑکنے لگا، ''کہو، بی بی!''

چاچی اُس کے ساتھ آکھڑی ہوئی، ''میرے کھانے پینے کا اتنا دھیان کیوں رکھتے ہو رے؟''

''تمہیں بُرا لگتا ہے، بی بی؟''

''نہیں، اچھا لگنے لگا ہے ——''

اُن دونوں کے قدم آپ ہی آپ ایک تنہا کونے کی طرف اٹھنے لگے۔

''میں نے سنا ہے —— کیا نام ہے تمہارا؟ —— ہاں، جانتی ہوں، میں نے سنا ہے لالو، دو چار مہینوں میں ہماری یہاں بیرکوں سے چھٹی ہو جائے گی۔''

''ہاں،'' لالو گویا جی ہی جی میں کوئی بڑا اہم فیصلہ کر رہا تھا۔ ''تم کہاں جاؤ گی؟''

''چاہو تو تمہارے ہی سنگ۔'' کنجری نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

لالو سے خوشی سے چلا نہ گیا۔ ''بیٹھو، یہیں ذرا بیٹھ جاتے ہیں۔''

وہ دونوں بیٹھ گئے تو چاچی گوراں اُسے بتانے لگی۔ ''میں کوئی گھر گرہستن نہیں ہوں لالو، کہ دھوکا دے جاؤں۔''

لالو نے چاچی کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم کر رکھی تھیں
''مگر شادی تو ہمیں کرنا ہی ہوگی۔''

''سچ!؟''

بابا لالو کہا کرتا، اُس وقت گوراں مجھے اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ ایک بار

تو میں نے طے ہی کر لیا، شادی کی ایسی تیسی، سب کی نظریں بچا کر اُسے اسی دم سیدھا اپنے کمرے میں لے جاؤں۔

''تم پہلے مرد ہو لالو، جس نے مجھ سے شادی کی بات کی ہے۔'' چاچی گوراں نے کسی گرہستن کی طرح اپنا سر ڈھانپ لیا۔ ''مجھے ساری عمر حصے سے دگنی دال بانٹا کرو گے۔''

''تو تمہیں منظور ہے؟''

''منظور کیوں نہیں ہوگا رے؟ ایک دم عمر بھر کا سودا کرنے پر راضی ہو گئے ہو، یہ کوئی معمولی بات ہے؟''

تھوڑی دیر میں جب وہ وہاں سے اٹھنے لگے تو لالو نے ہنس کر دلہن چاچی سے پوچھا۔ ''مجھے بھی دھکا دے کر گرا تو نہ دو گی بی بی؟''

''مجھے بی بی مت کہو۔'' چاچی نے اپنا دوپٹہ سر سے جھٹک دیا، ''کسی کنجری سے کبھی واسطہ پڑا ہے؟'' وہ اپنے مرد کے ساتھ جُڑ کر کھڑی ہو گئی۔ ''ہم لوگ بدنام ضرور ہیں پر پائی پائی کا حساب چکائے بغیر اپنا دم بھی نہیں نکلنے دیتے۔''



(۲)

بیرکوں کی قید اور کام سے چھٹی پا کر بابا لالو کو سب سے پہلے یہ مسئلہ لاحق تھا کہ اب رہیں گے کہاں۔

''اِس میں کیا مشکل ہے۔'' گوراں چاچی نے اُس سے کہا۔

''تم میرے دل میں رہو گے اور میں تمہارے دل میں''۔

''اس طرح تو ہم کبھی مل ہی نہ پائیں گے''۔

گوراں گمبھیر ہو گئی ـــــ ''ہاں، ملنا تو گھر میں ہی ہو تو ہو''۔

وہ دونوں سر جوڑ کر تا دیر اپنے اس مسئلے کو سلجھانے کی کوشش میں الجھاتے رہے۔

مگر لکڑی کے دھرم سالے کے مہنت جالم سنگھ نے اُن کا مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیا۔

''اوئے لالو، اس میں کیا مشکل ہے؟ تمہارا گھر ہم تینوں مل کر بنالیں گے۔ مہنت جپ جی صاحب کی کوئی پاوڑی پڑھنے کے انداز میں بے اختیار ہنس پڑا

''میرے واہگورو نے مجھے کسی کام کا نہیں رہنے دیا، نہیں تو میری بھی

لگائی ہوتی اور تین کے بجائے ہم چار ہوتے ——

''بابا لالو اور مہنت جالم سنگھ بڑے یار غار تھے،'' اور تمہارا گھر ہور بھی جلدی بن جاتا''۔

''تم اپنے واہگورو کو خواہ مخواہ دوشی ٹھہرا رہے ہو جالمے!'' اُسے جالمے، کہہ کر بلاتے ہوئے لالو کو خیال گزرتا کہ اگر ظالمے کہیں تو وہ اپنی بجائے کوئی اور ہی معلوم ہو۔

''اوئے تمہیں کیا پتہ؟ اُسی کا تو سارا دوش ہے۔ نہ میں اُس کو اپنے ساتھ اُیدھر لاتا، اور نہ وہ میرے کان پکڑ کے سدا مجھے دھرم سالے میں بٹھائے رکھتا۔'' جالم سنگھ کو جب بستی میں جا بسنے کی اجازت ملی تھی تو اُس نے اُنہی دنوں سنگھ سنگت کی مدد سے اَبرڈین بازار کی پیٹھ پر اپنا لکڑی کا دھرم سالہ کھڑا کر کیا تھا۔ لو بھائی واہگورو، اب تم بھی چین سے رہو اور میں بھی ——

''مگر بھائی جالمے، خون تو تم نے کیا تھا۔'' لالو نے اپنے دوست سے پوچھا تھا۔ ''سزا بھگتنے کے لئے اپنے واہگورو کو بھی ساتھ کیوں لے آئے؟''

''اوئے بھلیا لوکا، تم کیا جانو؟ واہگورو کی مرجی ناں ہوتی تو مجھے کھون کا کھیال ہی کیاؤں آتا؟ ——''

''تم نے تو میری جان میں جان ڈال دی ہے جالما۔'' لالو اپنے دوست سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا —— ''ورنہ میں اور گوراں سوچتے تھے، شادی کے بعد رہیں گے کہاں؟ ——''

''اوئے مورکھا، بیاہ کے موکے پر سوچنے وچنے کا کیا کام؟'' اُس نے لالو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ دیا۔ ''دیکھو، تمہارے بیاہ کا سن کر میرا دل کھوشی سے کتنا تیز دھڑکنے لگا ہے۔ اوئے میں اپنی کھوشی بیان نئیں کر سکدا یارا۔'' مگر اُس کا چہرہ یکبارگی لٹکنے لگا۔ ''میں جب اتنا کھوش ہوتا ہوں تو جانتے ہو، کیا ہوتا ہے؟''

''کیا ہوتا ہے؟'' چاچی گوراں مہنت کے کمرے میں اُس کی چیزیں

جا بجا گری پڑی پا کر اُنہیں ٹھکانے پر رکھ رہی تھی، وہ اپنا ہاتھ روک کر اُسے متجسس آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''بڑا اجیب ہوتا ہے بھابھی۔'' اُسے جواب دے کر وہ لالو سے پوچھنے لگا، ''بھائی ویر سنگھ، تمہیں جاد ہے لالو؟''

''ہاں جالمے، اُس ویر شہید کو کیسے بھول سکتا ہوں۔''

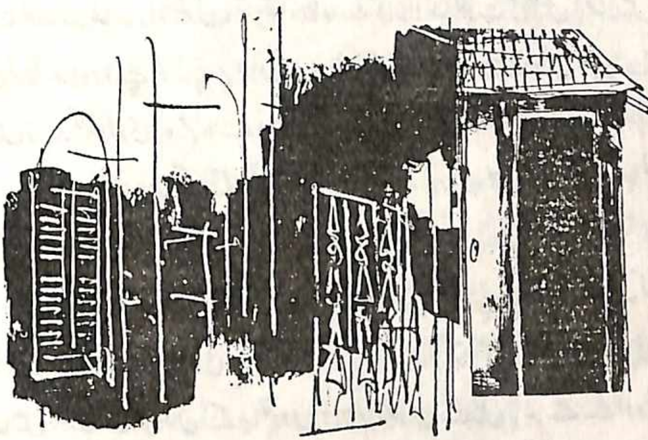
''بھابھی۔'' جالم سنگھ گوراں کی طرف سر اٹھا کر بتانے لگا ''بھائی ویر سنگھ سیلولر جیل میں ہمارے ساتھ ہی تھا، میرا سیل نمبر ایک سو گیارہ تھا اور اس کا ایک سو بیس، نئیں بھائی ہماری تراں کھون ڈکیتی پر کالے پانی نئیں لایا گیا تھا۔ نئیں، وہ نیتا گری بھی نئیں کرتا تھا، سدّھا سادا اسکول ماشٹر تھا، ہمارے ہی جلا سیالکوٹ کی تسیل ڈسکہ میں اردو پڑھایا کرتا تھا اور اپنے خرچے پر اردو میں اپنی کتابیں چھاپا کرتا تھا، کسی دشمن نے کُھپیا پولس میں رَپٹ لکھوادی وہ بم بنانے والوں سے ملا ہوا ہے۔''

بھائی ویر سنگھ کے قصے پر کان دھرے گوراں بھول ہی گئی کہ جالم سنگھ بتانے کیا چلا تھا اور بتا کیا رہا ہے۔

''پھر بھابھی، اُسی رات پولس بھائی ویر سنگھ کو چار پائی سے گھسیٹ کر لے گئی، اُسے بہت مارا پیٹا پر بھائی نے کچھ کیا ہوندا تو کچھ اُگلتا بھی۔ اُس نے تو اپنی اِک کتاب میں بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی تاریپھوں کے پُل باندھے تھے اور بس۔ ادالت میں وہ بولا تھا، میرا اتنا بھاگ کہاں کہ میں بھگت سنگھ کا ساتھی ہوتا۔ میں تو اس مہاپرش کے پاؤں کی جوتی بھی نئیں۔''

''بس اِتی سی بات پر نیک بخت کو کالے پانی بھیج دیا گیا؟'' کنجری نے روہانسی سی ہو کر پوچھا—— ''میرے شرابی گاہک تو نشے میں دھت ہو کر انگریزوں کو ماں بہن کی گالیاں بکا کرتے تھے۔''

''بدنیت لوگوں کو خدا کے نیک بندوں سے بڑا خوف محسوس ہوتا ہے بی بی۔'' لالو اسے سمجھانے لگا۔ ''شک اور خوف کی پرچھائیں میں اُنہیں ہر سیدھ ٹیڑھی نظر



آتی ہے۔ بھائی اُنہیں سچ مچ بڑا خطرناک دہشت گرد معلوم ہوتا ہوگا۔ تمہیں وہ ڈُ ڈمین یاد ہے جالمے؟ اس حرامی پلے نے بھائی کی بیڑیاں آخری دم تک نہ کھلنے دیں بی بی'' ——— وہ ذرا رک گیا۔ شاید وہ بھائی ویر سنگھ کے بھوت کو بیڑیوں کی کھن کھن میں اس طرح اپنے ذہن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے سیل میں قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چلا آرہا ہو۔

یہاں پہنچ کر وہ سال چھ ماہ میں ہی چل بسا۔ آخری دنوں میں تو لگتا تھا کہ مر چکا ہے اور مرنے کے بعد بھی سزا بھگتنے جارہا ہے۔''

رَب کے اِن نیک بندوں کو اپنی سجا بھگتنا بھی نہیں آتا بھابھی، ہماری تراں چور ڈاکو ہوں تو جیل کو بھی سسرال بنالیں ———''

''میری طرح!'' لالو اداس ہوگیا تھا مگر ہنسنے لگا اور یہ دیکھ کر کہ گوراں جالم سنگھ کی چیزیں پھر قرینے سے جمانے میں لگ گئی ہے، بولا ''ارے بھائی، جالما خود آپ کہاں اپنی جگہ پر ٹکا رہتا ہے جو اُس کی چیزیں ٹکا رہی ہو۔ آؤ، بیٹھ جاؤ۔''

وہ ہنستی ہوئی اُن کی جانب پلٹ آئی اور اُن کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''تم جانتی ہو بھابھی، جیل میں سر پھ تین بار ٹٹی پیشاب کا آرڈر ہے۔ بھائی ویر سنگھ کو جب ٹٹیاں لگ گئیں تو وہ کتا ڈُ ڈمین اُسے ٹھوکر مار کے بولا کرتا تھا، سالا گنڈا آدمی! ——— سیل کو ایک ڈم ساپھ مانگتا۔ چلو پھرش کو چاٹ چاٹ کر ساپھ کڑو ———''

''چھی چھی! ——— مجھے دوش نہیں دینا، للوا ———'' گوراں اپنے مرد کی طرف منہ اٹھا کر کہنے لگی۔ ''اگر یہ کلموا انگریز ابھی یہیں ہے تو میں اُسے کل ہی گولی مار نے نکل پڑوں گی۔''

''وہ گولی کھا کے بھی بچ جائے گا بی بی، اور تمہیں پھانسی ہو جائے گی اور میرا بنا بنایا سنسار اجڑ جائے گا ———''

''اور میں اپنے واہگورو کو دھرم سالے سے نکال دوں گا اور پُچھوں گا، جبھی

ہے تمہارا انسا پھ؟——''

گوراں اچانک اچھل کر جالم سنگھ سے پوچھنے لگی۔ ''مگر تم وہ بتانا بھول ہی گئے بھائی۔'' اُس کے منہ سے بھائی، سن کر جالم سنگھ کی باچھیں کھل گئیں اور وہ سوچنے لگا کہ بھابیاں تو بہت مل جاتی ہیں مگر واہگورو کے پُن پرتاب سے مجھے بیٹھے بٹھائے بہن مل گئی ہے۔

''کیا بھول گیا بہنے؟''

''کہ جب تم بہت زیادہ خوش ہوتے ہو تو کیا ہوتا ہے۔''

جالم سنگھ کا چہرہ پھر لٹک گیا۔

''جب مجھے کھشی ہی کھشی ماسوس ہوری ہوتی اے، تو بھائی ویر سنگھ کا مردہ میری آنکھوں میں گھوم جاندا ہے۔''

وہ تینوں گویا ایک دوسرے سے جدا ہوکر بھائی ویر سنگھ کے پیچھے پیچھے عدم میں جا کھوئے ہوں، مگر سانس رک نہ جائے تو ہم اُسی پل واپس اپنے جسم کے جہنم میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔

گوراں نے لالو کے قریب سرک کر جالم سنگھ کو مخاطب کیا۔

''میری مانو بھائی، اور تم بھی اب جھٹ پٹ بیاہ کرلو۔''

''پَر کس سے، میریے بہناں؟'' جالم سنگھ معصوم جانوروں کی طرح جھٹ ہی آگا پیچھا بھول کر اُسی ایک لمحے کی طرف مڑ جاتا تھا جو عین اُسی دم درپیش ہوتا۔'' مجھے تمہارے للوا کی اردو پھارسی تو آتی نہیں جسے بول کر اپنا الوسیدھا کرلوں اور واہگورو کو پتہ بھی نہ چلنے دوں، مجھے تو اِک اپنی گورمکھی آتی ہے اور اِک جہی بولی سکھنے جنانیاں میرے پاس آتی ہیں، سو واہگورو پھورن میرے کان میں پھونک دیتا ہے، کھبردار، سردارہ! سر پھ گورمکھی پڑھاؤ!——''

جالم سنگھ کی کنجری بہن ہنس ہنس کر اُس کی گود میں جھکتی چلی آئی۔

''سو بہناں میریے، میں نے تو ساری اُمر گورمکھی پڑھا پڑھا کے جائع

کردی اے۔''

''عمر تو جیسے بھی گزارو جالما، آخر میں ضائع ہی ہو جاتی ہے۔'' لالو نے شاید اپنی دلہن کو مرعوب کرنے کے لئے اپنا لہجہ بھاری بھر کم کرلیا۔

اور جالم سنگھ کو اُسے سن کر جتنا سمجھ میں آیا اتنا ہی کافی سمجھ کر بولا، ''نہیں، لالو، میں تم دونوں کو جایا نہیں ہونے دوں گا۔ ہم تینوں مل کر چار دن میں تمہارا پکا گھر کھڑا کردیں گے۔ اُس وکھت تک میری بہن اور تم میرے واہگورو کے ساتھ اتھے ہی رہو۔'' اُس نے اپنی ایک ایک بھول کا خیال کر کے یکبارگی قہقہہ لگایا۔ ''اوئے بھول ہی گیا تھا، ہم تین کیا وں؟ چوتھا میرا واہگورو بھی تو اے!۔ اوئے نہیں، چوتھا بھی کیاؤں؟ وہ کلّا ہی تمہارا گھر آکھ جھپکنے میں کھڑا کردے گا۔ اوئے، تم لوگوں نے چائے وائے تو پی ہی نہیں۔ اٹھ میری بی بی بہناں، سبھناں لئی گرم گرم چائے بنا دے۔۔۔۔''

(۳)

سرکار نے لالو کو اتنی زمین الاٹ کی تھی کہ تین کمرے ہنس کھیل کے بن سکتے تھے مگر لالو کے پاس ہنسنے کھیلنے کو اتنا پیسہ کہاں تھا۔ جتنی پونجی اُس نے اور گوراں نے جیل کے کام سے بچا رکھی تھی اُس سے دگنی جب مہنت جالم سنگھ نے اُن دونوں کے آگے ڈال دی تو وہ اُسے احسان مند آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

''اوئے میری تر پھ بٹ بٹ کیا دیکھ رہے ہو؟ میں کس باگے کی مولی ہوں؟ میرے سارے چنگے کام واہگورو ہی کرتا اے''۔

لیکن مہنت جالم سنگھ کی پونجی ملا کر بھی وہ بڑی مشکل سے ایک ہی کمرہ کھڑا کر پائے۔

''ابھی ایک ہی بہت ہے لالو۔'' مہنت نے اپنے یار کی پیٹھ تھپک کر کہا، ''آگے آگے واہگورو کئی ہور بنا دے گا ——'' مہنت نے پھر اپنا منہ گوراں کی طرف پھیر لیا۔ میرا دھرم سالے، کا پھرش پہلے پہل کچی مٹی کا ہی تھا، اسی لئے شروع میں کچی مٹی کا دھرم سالہ کے نام سے مشاہور تھا۔ پھر واہگورو نے اپنے آپ پر کرپا کی تو پھرش پر پلاؤں پتھر بھی آ گیا۔ وہ تم پر بھی جرور کرپا کرے گا، پھر دیکھنا، کیسے تمہارے گھر کی منجل

پہ منجل چڑھتی چلی جاندی اے —— ''ست نام شری واہگورو! —— ''مہنت نے اُن دونوں کی خیر کی دعا مانگنے کے لئے اپنے ہاتھ باندھ لئے۔

''ایسا کیوں، جالمے؟ لالو اُس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''تم اپنے رب کے گُن اس طرح گاتے ہو جیسے وہ تمہارا مالک ہو اور اُس سے لڑتے جھگڑتے اِس طرح ہو جیسے وہ تمہارا بڑا پکا یار دوست ہو۔''

''اوئے لالو، وہ میرا مالک تو ہے ہی —— وہ سارے سنسار کا مالک اے، پر سچ پُچھو، تو وہ ہے اپنا یار پادشاہ ہی، پُچھوں کیاؤں —— اور بتاؤ مجھے، کیا اسے میرے واہگورو کا جی جگرا نہ مانو گے؟ اِیدھر مجھے کالے پانی کی سجا ہوئی، اودھر وہ میرے سامنے ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور اڑ گیا کہ جالما۔ میں بھی تمہارے سنگ جاؤں گا۔

اُس کی آنکھوں کو بادلوں کا سایہ ڈھانپنے لگا۔

''تم پچھتے ہو لالو، اپنے سنگ میں واہگورو کو بھی سجا بھگتنے کیاؤں لے آیا؟ اوئے میں نے تو اس کو لکھ سمجھایا، میرے سنگ تم بھی کیوں مرتے ہو بھلے لوک؟ پر جو کسی کی سن لے وہ رَب ہی کیا؟ پھر بھی ایک بات تو مان گیا بھرادا۔ امیر کا رَب تو لڈو پیڑوں کی نگرانی میں سویا پڑا رہتا اے، پر بہناں'' اُس نے گوراں کو بھی اپنی دلیل میں شامل کر لینا چاہا —— ''گریب کا سائیں وکھت آنے پر اُس کے ساتھ پھانسی پر بھی چڑھ جاتا ہے۔'' جالم سنگھ کے دل و دماغ میں گھنگھور گھٹا ہونے لگی اور اُس کے بھٹکے بھٹکے وچار چھت کی تلاش میں ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔

''ایسے لئی گریب سب کو چھوڑ سکدا اے، پر اپنی جان نکل جانے پر بھی اپنے رَب کو نئیں۔''

''ٹھنڈے ٹھنڈے بات کرو بھائی، گھبرا کیوں رہے ہو؟''

''نئیں میں گھبرایا نئیں رِیا۔ سچ بول رِیا ہوں بہن میریے۔ مُنش جو بھی اچھا یا برا کرتا اے، رَب اُسے پھلوں کی تیراں سنبھالے رکھتا اے، اوئے نئیں بہناں، سرکار تو ہتھ دھو کے میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اُس نے مجھے پھانسی لگوانے میں کوئی کسر نہ



چھوڑی تھی۔ میں نے کھون تو کیا تھا پر جس کا کھون کیا تھا وہ مجھ سے بھی کھون کھار تھا۔ شر پسھ لوگ اُس کے ڈر سے منہ چھپاتے پھرتے تھے، کوئی پولس کا سپاہی اُس کی جان لے لیتا تو تھانیدار بنا دیا جاتا۔ نہیں، اس تراں بات نہیں بنے گی، میں تمھیں اپنی پوری کہانی سناتا ہوں——"

"نہیں جالما۔" لالو نے اسے ٹوک دیا۔ "تمہاری پوری کہانی میں سو بار سن چکا ہوں۔"

"تم سن چکے ہو، میری بہن نے تو ایک بار بھی نہیں سنی"۔

"پھر تم اپنی بہن کو ہی سناؤ، میں بازار سے ہو کے آتا ہوں۔"

"ہاں، چلو، میں بھی تارے سنگ چلتا ہوں"۔

"اگر تمہیں بھی جانا ہے جالمے، تو اکیلے جاؤ۔ مجھے اور تمہاری بہن کو گھر ٹھیک ٹھاک کرنے کا ٹائم مل جائے گا۔"

مگر جالم سنگھ ایکدم اٹھ کر بولا۔ "کالے سنگھ نے کہا تھا وہ اپنے بِنّے کے نام سنسکار واستے آئے گا"۔

جالم سنگھ کے باہر نکلتے ہی لالو نے اپنے دونوں ہاتھ گوراں کی طرف پھیلا دیئے۔ "آؤ، بی بی——"

"تمہیں کئی بار سمجھا چکی ہوں مجھے بی بی مت کہا کرو۔"

"تو کیا چاچی کہا کروں؟"

"تو کیا میں تمہیں اپنی چاچی لگتی ہوں؟" گوراں چاچی اپنی جگہ سے پھسل کر اُس کے بازوؤں میں آ گری۔ "زیادہ سے زیادہ پانچ ہی سال تم سے بڑی ہوں گی۔"

"گوراں بی بی——"

"ہاں، بولو"

"بی بی——"

''ارے کچھ بولو بھی بابا''

''تمہیں دیکھتے ہوئے مجھے لگتا ہے میری ساری خواہشیں پوری ہو رہی ہیں——''

''مگر میری خواہشیں پوری کرنے کے لئے تو تمہیں خوب ہاتھ پیر ہلانا پڑیں گے۔'' کنجری ہنس پڑی تو لالو کو محسوس ہوا کمرے کے باہر بے بادل پھوار پڑنے لگی ہے جس سے اُس کے آنگن کی کنواری دھرتی کی سوندھی سوندھی آوارہ سانسوں سے سارا آس پاس بھر گیا ہے۔

''میرا باپ تو کیا پتہ، کون تھا بی بی، مگر ایک باپ مجھے مل گیا تھا——''

جو عورت ہمیں اپنے دل و دماغ میں اٹھتی بیٹھتی محسوس ہونے لگے، اُسے اپنے بارے میں کچھ بتا کر، یا اُس سے اُس کے بارے میں کچھ پوچھ کر، یا پھر منہ سے یا جی ہی جی میں اُس سے یونہی ادھر اُدھر کی باتیں کر کے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اُسے چوم چاٹ رہے ہیں۔ ''بابو اللہ دتا اُس کا نام تھا۔ بڑا پیا سا اور کنوارہ تھا۔ شروع میں تو وہ مجھے اپنی بیوی کی جگہ پر برتتا رہا اور باپ کی طرح کھلاتا پلاتا رہا، مگر آخری دنوں میں وہ میرا صرف اور صرف باپ بنا رہا۔''

چاچی گوراں منہ دبا کر ہنسنے لگی۔

''اس میں ہنسنے کا کیا ہے؟''

''ہنسنے کا ہی تو ہے، اپنے ملک میں میرے پاس بھی اِسی طرح کا ایک بڈھا آیا کرتا تھا۔ جب اُس کے جانے کا ٹائم آتا تو کہتا، چلو اب اوندھی ہو جاؤ۔''

لالو کے دماغ میں جھٹکا سا لگا۔

''مجھے کیوں بتا رہی ہو بی بی؟''

چاچی نے بابا کے اور قریب کھینچ کر اپنی سانسیں اُس کی سانسوں میں گھول دیں۔ ''ایک تم ہی تم تو ہو، اور کسے بتاؤں؟'' اُسے شادی پور کے دفتر میں پچھلے ہفتے کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ''شادی پور کا وہ دھپت رائے ہے نا؟—— ارے وہی، جو

سرکاری دفتر میں نئے جوڑوں کے نام درج کرتا ہے، وہ ہماری جیل میں بھی اِستری سُدھار کے کام دھندے سے آیا کرتا تھا۔ تم بس ذرا مجھے اس کے کمرے میں چھوڑ کر گئے۔ مشٹنڈا ایک آنکھ میچ کر مسکرانے لگا، دوسری بار کب آ رہی ہو چاچی؟ —— میں نے پوچھا، کیا دو دو بار شادی کرنے آنا پڑتا ہے؟ —— بولا، نہیں، پر جب چاہو، لالو کا پتہ کاٹ دوں گا —— بھڑوے کا منہ نوچ لیتی پر سوچا، ابھی ابھی جیل سے چھٹی ہوئی ہے ——"

"تم نے مجھے وہیں کیوں نہیں بتایا؟"

لالو سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گوراں اس کی چھاتی کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی، "ہمیں اُس سے کیا لینا دینا ہے؟ دنگا فساد تو وہ کرتے ہیں جن کے گھر میں دانے نہ ہوں۔ میری طرف دیکھو، تمہارے گھر میں تو جادو کی تھیلی ہے۔ کھاتے جاؤ، کھاتے جاؤ، وہ کبھی ——"

"خالی نہ ہو۔" لالو نے دانوں بھری تھیلی میں ہاتھ ڈال لیا اور آنکھیں میٹ کر اُسے دشمن بھی سجن معلوم ہونے لگے۔

"تم اپنے بابو اللہ دِتا کے بارے میں کیا بتا رہے تھے؟" گوراں بدستور اپنی انگلیوں کی پوروں سے اُس کی چھاتی کے گھنے بالوں میں کنگھی کئے جا رہی تھی۔

"بابو اللہ دِتا اپنے ارتحال سے پہلے ——"

"میں تم سے کئی بار کہا ہے، مجھ سے راست باتیں کیا کرو۔ عربی فارسی بول بول کے نہیں۔"

"فارسی تو تم بھی بول رہی ہو۔"

گوراں نے بڑے فخر سے جواب دیا —— "کوٹھے پر شروع شروع میں میں غزلیں بھی گایا کرتی تھی، اگر تم کہیں مل جاتے تو تمہیں ہی استاد بنا لیتی۔"

"میں تمہیں کوٹھے پر رہنے دیتا، تب نا۔"

"اُس وقت بھی کھلم کھلا گھر ڈال لیتے؟"

ستیہ وتی سے فارغ ہو کر مجھے اور کام ہی کیا تھا؟ مگر پہلے بابو اللہ دِتا کی تو سن لو،'' لالو اپنے سامنے ہوا میں اللہ دتا کو ٹھوکر کھا کر سجدے میں گرتے دیکھنے لگا۔ ''بابو اٹھتے بیٹھتے سجدے میں گر جاتا تھا اور میں اُس سے پوچھا کرتا، خدا سے مانگتے کیا ہو بابو جی؟—— جنت!—— ''وہ جواب دیتا، اپنے اور تمہارے لئے جنت''۔

لالو نے گوراں کو اپنی طرف کھینچ کر چوم لیا۔ ''مجھے تو میری جنت مل گئی ہے، میں سوچتا ہوں، دعا پوری ہو جائے تو پوری کی پوری، پوری ہوتی ہے۔ بابو کو بھی مرنے کے بعد ضرور مل گئی ہوگی اور وہ بھی اِس وقت دو جہاں بھول کے کسی حور کی رفاقت میں بیٹھا ہوگا۔''

''واقعی تمہیں کوئی حور معلوم ہوتی ہوں، یا بنا رہے ہو؟'' وہ لالو سے معذرت مانگنے کے انداز میں کہنے لگی، ''کیا کروں؟ ذات کی کنجری ہوں، تم پر یقین کر لینے پر بھی شک سے باز نہیں آتی۔''

''تم واقعی حور ہو، بی بی' اور مجھے ہر جنم میں مل جاتی ہو۔''

''ہائے رے للوا، تمہاری ایسی ہی من موہنی باتوں نے مجھے پھانس لیا۔'' ہم بامنوں میں گھر والیاں ایک تہوار پر سارا دن بھوکی رہتی ہیں، تاکہ اگلے جنم میں بھی اُن کی شادی اپنے ہی مرد سے ہو۔''

گوراں کی بات پر ایک انڈیمانی کتھا اُس کے سر سے اُڑ کر ہونٹوں پر آ بیٹھی۔ یہ کتھا اُس نے ایک انڈیمانی گارڈ سے سن رکھی تھی۔'' ایک انڈیمانی گارڈ ہوا کرتا تھا بی بی۔ جاروا قبیلے کا تھا۔ جاروا باہر کے لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے اور اپنے چھوٹے جزیروں میں قطعاً الگ تھلگ رہتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ جاروا گارڈ انگریزوں کے ہاتھ کیسے آ گیا۔ یہ لوگ اپنے جزیروں میں ننگ دھڑنگ گھومتے پھرتے ہیں——''

''تمہارا مطلب ہے، بالکل ننگے؟ اُنہیں شرم نہیں آتی؟''

''شرم کیسی؟ وہ تو ہم پر ہنستے ہیں کہ اپنی کھال پہن کر اوپر کپڑے بھی پہن

لیتے ہیں۔'' رستو —— ہاں —— رستو اُس جاروا گارڈ کا نام تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں وردی کے اندر اپنی کھال چھو کر تسلی نہیں کر لیتا تو لگتا ہے کہ گٹھری میں بندھا ہوا ہوں، پر گٹھری خالی ہے، وہ میرا بڑھا گاڑھا دوست بن گیا تھا۔ ہمارے چھوٹے جیلر کے گھر کی جھاڑ پھونک بھی کیا کرتا تھا اور وہاں سے میرے لئے سگریٹ اور کبھی کبھی شراب بھی چرالاتا تھا۔''

''اپنے لئے نہیں؟''

''اپنے لئے چرا کے وہیں پی لیتا ہوگا۔''

''کالے پانی تمہارے لئے سچ مچ سسرال بنا رہا لالو۔''

''مگر سسرال میں کتنے بھی سکھ ہوں بی بی، آدمی ایک بندھا بندھا سا رہتا ہے۔'' اپنی جورو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے اور کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

''تم تو اس گارڈ کی کوئی بات سنانے چلے تھے۔'' گوراں اکثر اس سے کہا کرتی تھی ''کہ تمہیں جانا کہیں اور ہوتا ہے اور نکل کہیں اور جاتے ہو——''

اسی لئے تو تمہارے پاس آ پہنچا ہوں بی بی!

وہ ہنسنے لگی۔

''ہنس کیوں رہی ہو؟''

''تو کیا روؤں؟''

''نہیں، مجھے دھیان سے سنو، ہم رستو کی نگرانی میں راس آئی لینڈ پتھر کوٹنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے جاروائوں کی تیراکی کی بہت تعریف کی تو وہ یہ کہانی سنانے لگا: ہم جاروا دراصل مچھلیوں کی اولاد ہیں۔ صدیوں پہلے ایک دفعہ ایک نہایت بھیانک سمندری طوفان نے مچھلیوں کے پشتوں کے پشتے مغربی گھاٹ کے جزیروں کے گھٹا ٹوپ بھیتر لا پھینکے، بے شمار مچھلیوں نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا، اور جو مرنے سے بچ گئیں وہ اِس لئے کہ اُنہیں جیئے جانے کی شدید خواہش تھی۔ یوں پانی کے یہ باسی خشکی پر ہی بس گئے اور جب اُنہیں بسے بسے ہزاروں سال گزر گئے تو آپ ہی آپ

مرد اور عورت کے جسموں میں ڈھل آئے۔'' لالو نے اپنی جاروائی کہانی یہاں روک لی۔ ''رستوُ کا کہنا تھا، انگریز اور تم لوگ چوپاؤں کی اولاد ہو اور ہم مچھلیوں کی، ہمارا تمہارا یہی ایک فرق ہے۔'' ہنستے ہنستے وہ پھر کہانی کو آگے بڑھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جاروائوں کو انسانی روپ تو مل گیا مگر اُن کی خوئیں بدستور مچھلیوں کی سی تھیں۔ انسانی یادداشت کے بغیر ماں بیٹے کو ہی شوہر مان کر اُس سے لپٹ کر پڑی رہتی، یا بیٹی سے باپ کی اولاد پیدا ہو جاتی، یا پھر جو جیسے بھی ہو جائے۔ یادداشت نہ ہونے کے کارن اُن کے یہاں رشتوں کی پہچان بس اُنہی پلوں کی تھی جو وہ جی رہے ہوتے اور بس۔'' لالو نے اپنی جاروائی کتھا کو پھر ذرا کھڑا کر لینا چاہا ——

''رستو کا یہ بھی کہنا تھا کہ انگریز لوگ جاروائوں کی کمزور یادداشت کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ایسے حالات پیدا کر رہے ہیں کہ جاروا اپنے جزیروں کی مالا کے موتی ایک ایک کر کے اُن کے قدموں میں پھینکتے رہیں۔''

''مگر اس طرح تو اُن کا ایک بھی موتی نہ بچے گا؟'' گوراں نے پوچھا۔

''تو کیا ہوا؟ سو پچاس ہی جاروا تو بچے ہیں، ۔ اُس وقت تک ایک بھی نہ رہے گا''۔ کھڑی کتھا نے سر جھٹک کر لالو کو متوجہ کرنا چاہا۔ ''اب آگے کی سنو: جاروائوں کے بڑے بوڑھوں نے آخر رشتے باندھنے کا یہ طریقہ نکالا کہ جب کوئی مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیں تو ساری برادری کے سامنے اُن کے بیاہ کی رسم ادا کی جائے اور اس رسم سے سات سورج پہلے —— وہ ایک دن کو ایک سورج قرار دیتے ہیں —— ہاں سات سورج پہلے مرد اور عورت بلا ناغہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سامنے بیٹھے رہیں ——''

''ہائے کتنی اچھی رسم ہے رے للوا! ہمارے لوگوں کے بچے اور کس لئے اپنے ماں باپ کی شکلیں لے کر پیدا نہیں ہوتے؟ اُس کی آنکھوں میں کوئی پڑوسی آباد ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں میں کوئی پڑوسن۔''

وہ کمر سیدھی کر کے لالو کے سامنے بیٹھ گئی۔ ''چلو میری آنکھوں میں دیکھنا

شروع کردو۔۔۔۔۔ آج سے ہم بھی ہر روز یہی کیا کریں گے۔"

دونوں سب کچھ بھول کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنی شبیہ دیکھتے رہے اور پھر لالو کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کے بھیتر گوراں ہی گوراں ہے، کہ وہ گوراں ہی ہو گیا ہے، اور گوراں کو، کہ وہ لالو، وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ہی سر جھٹک کر بولا "مگر آگے کی کہانی تو رہ گئی۔"

"ہاں۔ وہ بھی سناؤ۔"

"جار واؤں کے بڑے بوڑھے بڑے دور اندیش تھے۔ انہوں نے یہ شرط بھی لگا دی کہ بیاہ کے بعد ایک سو سورج کے اندر اندر ہر ودا ہت جوڑا کسی بارش کے دن اپنے جزیرے سے ایک سیدھ میں مچھلیوں کی طرح تیر کر سمندر بابا کے دل تک جا پہنچے اور وہاں وہ دونوں ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈال کر اپنے منہ آسمان کی طرف پورے کھول لیں اور بارش کے ان چھوئے شفاف قطرے حلق سے اتار لیں، بڑے بوڑھوں نے وردان دیا کہ ہر جنم میں ایسا کرنے پر وہ اگلے جنم میں بھی اپنے بچوں کے ماں باپ بنیں گے۔"

"مجھے بھی سمندر کے دل میں اتارے جاؤ للوا۔"

"تو آؤ۔ دیر کیوں کر رہی ہو؟"

وہ دونوں لیٹ کر بوندا باندی میں سمندر کے پانیوں میں تیرنے لگے۔



(۴)

اپنے ڈھائی منزلہ مکان میں بابا لالو جب تک اپنے اُسی کمرے میں قدم نہ رکھتا جسے اُس نے یہاں پہلے پہل بنوا کر اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز کیا تھا اُس وقت تک اُسے یہی لگتا وہ ابھی گھر نہیں پہنچا۔

گوراں چاچی کی آواز اُس کا سرپٹ پیچھا کرتی "میں تو ادھر رسوئی خانے میں ہوں بابا"۔

اپنے دو بیٹوں کو اُسے بابا، بابا پکارتے سن کر اب وہ بھی اکثر اُسے یہی کہہ کر بلاتی تھی اور بڑی فخر مند تھی کہ میں نے اپنے مرد کے بچے جن کر اُسے اتنا بڑا بابا بنا دیا ہے۔

بابا لالو جی ہی جی میں ہنسنے لگتا، "سارے بال تو پکا چکی ہو، اب اور کیا پکانا باقی ہے بی بی؟"

اُسے بی بی بلا کر بابا گویا اب بھی گوراں کا خالی پیالہ دال سے لبالب بھر رہا ہو۔ "آؤ، یہیں چلی آؤ۔"

"وہاں آ کر کیا کروں؟"

بابالالو سوچنے لگتا، پگلی کو معلوم نہیں کیا؟ ہمیں جو کچھ بھی کرنا تھا ہم نے اِسی کمرے میں تو کیا۔ زندگی بھر کی ہزاروں میل کی مسافت ایک بس یہیں طے کرلی۔ یہیں ہمیں اپنا پہلا بیٹا بیکل سنگھ ملا، جس کی پیدائش پر جالم سنگھ اور اُس کے واہگورو کا بھنگڑا تھمنے میں نہ آتا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ بابالالو نے مہنت کے لئے کڑاپرشاد تیار کروا کے اُس میں ذراسی افیون چھوڑ دی، جسے جالم سنگھ نے خوب سیر ہوکر کھایا اور غنودگی طاری ہونے پر گہری نیند سوگیا، ورنہ اپنے واہگورو کے پیچھے ناچتے ناچتے وہ اگلے جہاں پہنچنے سے پہلے رکنے میں نہ آتا۔

جالم سنگھ نے کہا تھا، یہ تمہارا پہلا جِیو ہے للوا، اِسے تو میں گورو کا سِکھ بناؤں گا۔

''ٹھیک ہے جالما'' ۔ بابالالو نے اُسے جواب دیا تھا۔ ''ٹھیک ہے، بنالو، پر اپنی طرح نہ بنانا''۔

''اوئے دشمنا، تیری تراں بھی بن گیا تو چلے گا۔''

بیکل کی پیدائش پر لالو نے سب کے سامنے اپنی بیوی کو والہانہ گلے لگا کر چٹاخ سے چوم لیا۔ جس پر کنجری کسی کنواری کی طرح شرما کر کمزوری کے باوجود لال بھبوٹی ہوگئی۔ ہٹو جی! ـــــ اور لالو نے ہٹ کر اپنی آنکھیں کچھ اس مانند نوزائیدہ کے چہرے پر گاڑیں جیسے اُس کے سامنے اپنے سراغ کی راہ کھل گئی ہو۔

بابالالو کی شدید خواہش تھی کہ اُسے بیٹی کا باپ بننا بھی نصیب ہو، جس گھر میں چڑیاں چہکتی پھرتی ہیں وہاں ہُن برسنے لگتا ہےـــــ

''پتہ نہیں، بابے، تیرے ہُن کا کیا مَتبل ہے؟ جالم سنگھ اپنے دوست سے کہتا ہے۔ ''پر ہماری بولی میں تو ہُن کو اب بولتے ہیں اور دیکھو، واہگورو، کے پن پرتاپ سے چاروں اور اب ہی اب برس رہا ہے۔ اور کیا چاہیئے؟ کپڑے اتار کر جتنا چاہو، نہالو۔''

دوسری بار بھی بابالالو کے یہاں بیٹا ہی پیدا ہوا اور وہ اپنے آپ کو یہ سمجھا

کر وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ بیٹی کی خواہش وہ اب پوتیوں پڑپوتیوں سے پوری کرلے گا۔

ہم کتنے سال جینے کا پٹہ لکھوا کر آئے ہیں للوا؟ گوراں چاچی اُس سے پوچھتی۔ ''اتنی ہی خواہش ہے تو دس بارہ ماہ میں ہی تمہاری بیٹی بھی جن دوں گی——''

''نہیں بی بی۔ ہماری جو خواہشیں پوری ہونے سے رہ جائیں گی اُنہیں ہمارے دونوں لعل پوری کردیں گے۔''

بابا لالو کو اپنا بچپن کچھ اِس طرح یاد تھا جیسا وہ سارے دن ابھی ابھی بیتے ہوں۔ بابو اللہ دتا جیسے بھی تھا، تھا وہ پانچ وقت کا نمازی، اور لالو کو بھی اس نے نماز پڑھنا سکھا دیا تھا۔ ''سیکھ لوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے سبھی گناہ بخش دے گا۔''

مگر بابا لالو کو تو اُن دنوں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔

''پر مجھے تو پتہ ہے۔'' بابو اللہ دِتا اُسے بتاتا، ''جہنم!۔جہنم! اللہ تعالیٰ گناہ نہ بخشے تو آدمی سیدھا جہنم میں جاتا ہے۔''

''جہنم کیا ہوتا ہے؟''

''پتہ نہیں کس کافر کی اولاد ہو؟ ارے بھئی، سمجھ لو کہ نماز پڑھنا سیکھ جاؤ گے تو خدا میرے گناہ بھی بخش دے گا۔''

''بخشنا کیا ہوتا ہے؟''

''میرا سر! چلو سیدھے سیدھے پڑھو، ورنہ سر قلم کردوں گا۔''

بابا لالو اللہ دِتا کی ہدایت پر دو زانو بیٹھ جاتا اور اللہ دتا پگھل کر اُسے سمجھانے لگتا، ''دیکھو، نماز پڑھنا سیکھ جاؤ گے تو اللہ وہ گناہ بھی بخش دے گا جو ابھی تم سے سرزد ہونا ہیں۔''

بابو اللہ دتا واقعی سچ کہتا تھا۔ ساری ساری رات اپنی بیوی کے پہلو میں لیٹنے کے بعد وہ علی الصبح چپکے سے بستر سے نکل آتا تاکہ اپنے گناہ بخشوانے کے لئے فجر کی نماز ادا کرلے، اور نماز پوری ہو جانے پر وہ خود کو اتنا ہلکا محسوس کرنے لگتا گویا زمین

پربت کا بت بیٹھا ہونے کی بجائے فرشتوں کی رفاقت میں آسمانوں میں اُڑ رہا ہو۔

اپنے چھوٹے بیٹے کی پیدائش پر بابا لالو کو یقین سا ہونے لگا کہ اولاد کی بدولت بھی ہماری بخشش کے اسباب رونما ہونے لگتے ہیں۔ سو اُس نے اپنی بامن بیوی سے بات کرنے کی ٹھان لی۔

''مانو تو ایک بات کہوں، بی بی۔'' لالو کو یقین تھا کہ میری بامنی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

''میری خواہش ہے ہمارا یہ بیٹا ـــــ مسلمان ہو''۔

گوراں چاچی ہنسنے لگی۔ ''تمہارا ہی بیٹا ہے، اپنی مرضی سے جو چاہو بنا لو۔''

اُس کے بڑے بیٹے بِکل سنگھ کا نام جالم سنگھ نے دے رکھا تھا۔ چھوٹی مسجد کے مولوی منظور احمد نے اُن کے اِس بیٹے کا نام محمد علی تجویز کیا۔ ''حضرتؐ کی ہدایت اور علی مرتضیٰ کی شجاعت سے بڑھ کر اور کیا چاہئے؟''

مولوی کو بھنے ہوئے چنے بہت مرغوب تھے، ''بھنے ہوئے چنے؟''

اُس کی جیبیں بھنے ہوئے چنوں سے بھری رہتی تھیں۔ ''لو، وہ بھی لو۔''

''چار دانے میرے لئے بھی نکال دے مولویا۔''

جالم سنگھ نے آگے بڑھ کر اُس کے سامنے اپنی ہتھیلی کھول دی۔ ''مؤ جھے تو ایوائی بھکر کھائے رکھدی ہے مولویا، کے جنت میں تو سِر پھ دودھ اور شہد کی ندیاں بہتی ہیں، تُجھے اوتھے بھنے ہوئے چنے کیسے ملیں گے؟ ـــــ'' مولوی کے چنے منہ میں پھانک کر وہ اُس کی پیٹھ تھپکنے لگتا۔ ''پر تو بھکر مت کر۔ جنت بیکنٹھ ساب سے بس اتنی ہی دور ہوگی جتنا سِمڑے سے سیالکوٹ۔ دوّنی چوّنی کے ٹکٹ پر ہی تیری جنت آن پہنچتی ہوگی، میں ہپھتے کے ہپھتے تیرا پورا راشن پہنچا آیا کروں گا، چنے ہی تو ہیں، کوئی ساڈھا کڑاہ پرشاد تو نہیں ـــــ''

(۵) ا

ایک بیکل کی بے کلی سے ہی لالو اور گوراں کے اکلوتے کمرے کے گھر میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی، محمد علی کے پیروں کو بھی پہیے لگ گئے تو بانس کی بچہ گاڑی کی ہنسوڑ پوں پوں میں سنگل روم کی ٹریفک جام ہونے لگی۔

''بچوں کو تو پیدا کر دیا ہے للوا۔'' گوراں چاچی اپنے مرد سے مخاطب ہو کر کہتی۔ ''اب اُنہیں بنانے کی فکر کب کرو گے؟''

''وہی تو سوچتا رہتا ہوں بی بی''

''نہیں، اب صرف میری عقل سے سوچو اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ پہلے دو کمرے اور کھڑے کر لو۔''

سو گھر کی نچلی منزل کی تعمیر تو لالو نے خوب محنت کر کے دنوں میں ہی پوری کر لی۔ اُس نے چوک میں پرچون سودے کی ایک چھوٹی سی دکان کھول رکھی تھی، جو خوب چل پڑی تھی۔ اُس نے تو طے کر رکھا تھا کہ سب سے پہلے وہ دکان کو آگے پیچھے بڑھا کر ایک بڑا سا پروویژن اسٹور چلانے لگے گا مگر گھر کی توسیع کی فوری ضرورت کے باعث اُس نے اپنا یہ پروجیکٹ اُس وقت تک التوا میں ڈالے رکھنے کا فیصلہ کر لیا جب تک



بکل میٹرک کر کے دکان میں اُس کا ہاتھ بٹانے کے قابل نہیں ہو جاتا۔

وقت تو جتنا اور جیسے بھی سست رو ہو ہمیں موقع پر اپنے آگے کہیں مل جاتا ہے۔ بکل نے میٹرک پاس کر کے دکان جو سنبھال لی تو وہ تھوڑے ہی عرصے میں اتنی چھوٹی پڑ گئی کہ اُسے کھلا کئے بغیر کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ بکل نے ایک بہت بڑا بورڈ بھی دکان پر نصب کروالیا، بابا اینڈ سنسز پروویژن سٹور۔ اپنے بیٹے کو اِس مانند پھلتے پھولتے پا کر مجرم ماں کے دل میں یہ چورسی خواہش سر اٹھانے لگی کہ اب جلدی سے بیٹے کی شادی کر کے ندی نہالے۔

''تم ایک نہاتی بہت ہو بی بی''۔

''تم جو نہیں نہاتے، بابا۔ تمہارا نہانا بھی نہ نہالیا کروں تو تمہارے قریب کھڑا ہو کے سانس لینا بھی دشوار ہو جائے۔''

''ہاں، للوا!''۔ جالم سنگھ لالو بابا کو مخاطب کر کے کہتا۔ ''دیکھو نا، میری بامنی بہن نے اپنے آپ کو مانجھ کر کس تراں چھیل لیا اے۔''

لالو بابا نے اُس وقت تک بکل کی شادی کو روکے رکھا جب تک گھر کی اوپری منزل کے کمرے کھڑے ہو کر فریاد نہ کرنے لگے، ہمیں کب تک خالی پیٹ کھڑا رکھو گے؟''

''اب یہ شبھ کام بھی کر ہی دو بابا۔''

''ہاں، بی بی، اب یہی بندوبست تو کرنا ہے''۔

مگر بابا لالو کو کیا پتہ تھا کہ جس بکل کی دلہن کی تلاش میں وہ گھر گھر جھانکتا پھر رہا ہے وہ جب ہر روز دکان کا مال خریدنے بڑے بازار نکلا ہوتا ہے تو فادر ڈینیل بخش کے گرجے کے پچھواڑے گونگی بڑھیا کے چبوترے پہنچا ہوتا ہے۔ گونگی بڑھیا کا پورا نام گونگی بڑھیا ہی تھا اور اس کی بیٹی کا نام، بلو۔ بلو دراصل بڑھیا کی بیٹی نہ تھی: اُس کی پیدائش پر ہی کون جانے کون اُسے گونگی بڑھیا کے چبوترے پر ڈال گیا تھا اور گونگی بڑھیا نے ہی اُسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔

گونگی بڑھیا نے پہلی بار بِلّو کو چبوترے کی کچی مٹی پر ننگے پنڈے آپ ہی ہنس ہنس کر روئی کے گالوں کی سی ننھی منی ٹانگیں مارتے ہوئے دیکھا تو پہلے تو دیکھتی رہ گئی اور پھر اپنے خوشی سے کانپتے ہوئے وجود کو دھکا دے کر اُس کے سر پر آ جھکی اور اُسے اپنے سینے میں چھپا کر جھونپڑے میں لے آئی۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو اُنہوں نے گونگی بڑھیا سے بچی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنا چاہا مگر وہ غوں غاں کرتے ہوئے ہر سوال کے جواب میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا دیتی۔

''ہاں بھئی، اوپر والے نے ہی بھیجا ہے مگر چھوڑنے کون آیا؟''

گونگی بڑھیا پھر انگلی اوپر کر کے غوں غاں کرنے لگتی۔

''اوپر والا خود چل کر آیا تھا؟'' کسی نے ہنس کر پوچھا۔

جب فادر ڈینیل کو معلوم ہوا تو اُس نے بڑی سنجیدگی سے سب کو بتایا، اِس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ اوپر والا بڑا رحیم اور کارساز ہے۔ وہ خود آپ ہی چل کر آیا ہوگا۔ فادر بھی خود چل کر اپنے چپّل کے پچھواڑے گونگی بُڑھیا کی جھونپڑی تک آیا اور بچی کو اپنی گود میں بیٹھا کر بپتائز کیا اور اسے معجزہ ہی کہئے کہ گونگی بڑھیا کی اُچھلتی کودتی غوں غاں میں سب کو کئی بار صاف سنائی دیا، بِلّو! —— بلّو! —— اور اس کے بعد بھی گونگی بڑھیا ساری زندگی صرف ایک بلو، بِلّو بول کر ہی جیتی رہی، بس ایک بِلّو ہی تھی، باقی جو کچھ تھا، نری پری غوں غاں۔

گونگی بڑھیا چرچ کے گراؤنڈ میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ بلو کی آمد کے بعد ڈھائی تین برس تک فادر ڈینیل بخش اُسے بِلّو کی نرم و گرم خوراک اور گھر بیٹھے اس کی بندھی ٹکی تنخواہ بھیج دیتا اور یوں بِلّو دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف جوان ہوگئی بلکہ جوان ہو کر بیکل سے عشق بھی کرنے لگی۔

بلو آئے دن بیکل کی دکان پر گھر کے لئے آٹا دال اور مرچ مصالحہ لینے آیا کرتی تھی اور بیکل اُس کی طرف دیکھنے کی بجائے عادتاً وہ سارا وقت سودے کی تول اور پیسوں کی گنتی میں گزار دیتا۔ بِلّو کو وہ اچھا لگنے لگا تھا اِس لئے اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ

سودے وودے سے سر ہٹا کر اُسے بھی دیکھا کرے، سو ایک دن اُسے کیا سوجھی کہ اُس نے جان بوجھ کر سودے کے کم پیسے ادا کئے اور جب بیکل نے دوبار پیسے گن کر اُس کی طرف سر اٹھایا تو اُسے مسکراتے ہوئے ایک ٹک اپنی جانب دیکھتے پا کر بقیہ پیسے مانگنا بھول گیا۔ اِس طرح یہ قصہ سودے سے شروع ہو کر پہلے تو ٹوٹی پھوٹی اور پھر سالم بات چیت تک پہنچنے لگا۔

''تم صرف سودا لینے آتی ہو؟''

''اور کس لئے آؤں؟''

اُس کی محبوبانہ مسکراہٹ آخر لب کشا ہو کر بیکل سے من چاہی باتیں کرنے لگی تو بیکل سے رہا نہ گیا۔

''کیا میں بھی سودا لینے تمہارے پاس آجایا کروں؟''

''مگر میرا سودا بہت مہنگا ہوتا ہے۔''

''میں ہر روز بڑے بازار جاتا ہوں، تمہارا گھر راستے میں ہی تو ہے۔''

کئی بار تو بیکل اپنا بڑا بازار بھول کر راستے میں رکا رہ جاتا۔

''بابا۔'' وہ لوٹ کر لالو کو بتاتا۔ بنتا کہتا تھا، کل ذرا جلدی جلدی پہنچ جانا، کل تازہ مال آنے والا ہے۔''

بلو بیکل کو ہر روز تازہ بہ تازہ لگتی، وہی، پر جیسے وہ ہر روز اُس سے پہلی بار مل رہا ہو اور پہلی نظر میں ہی اُسے دل و جان دے بیٹھا ہو اور دل و جان دے کر مٹی کا مٹی ہو کر رہ گیا ہو۔ بلو کو اپنا یہ مٹی کا مادھو اتنا اچھا لگتا تھا کہ وہ بدھو، بدھو، دہراتے ہوئے اُس سے لپٹ جاتی تھی۔

ابھی نہیں ——

تو پھر کب، بدھو؟

شادی کے بعد۔

''میرا پُتر تھا تو لڑکی ہی۔'' جالم سنگھ کو بیکل پاپا کہا کرتا تھا اور باپ کو

بابا۔ ''پر میرے واہگورو نے اپنی الٹی مَت برت کے اونوں لڑکا بنا دیا، میں بیکل کو کئی بار کہہ چُکیاں ہوں، کوئی کڑی پکڑ کے گوردوارے لے آ اُو پُترا۔ میں اُسی وقت تمہارے پھیرے کرواں دیاں گا، باقی میرا واہگورو آپے دیکھتا پھرے گا، پر وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں۔''

بیکل نے سیدھے بابا سے بات کرنے کی بجائے اپنے بیکل پاپا کو ہی اپنے پیار کا قصہ توڑ توڑ کر بیان کر دیا۔

''اتنی سونی کہانی کو توڑ توڑ کر کیاؤں سنا رہے ہو؟ ایک دم بولو نا، کہ بات بن گئی۔'' ماموں نے بھانجے کی پیٹھ تھپکی۔ ''اب دیری کیاؤں؟ گونگی بڑھیا سے مل کر آج ہی تاریکھ پکی کر لیں گے۔''

''بلو کی مائی بھی بہت خوش ہے پاپا۔''

''اوئے پاپے کے سونے پتر، اُس مائی کا کیا ہے؟ سب کچھ کرنا تو میرے واہگورو نے ہے۔ آؤ پہلے واہگورو کو بتاتے ہیں۔ نہیں، اُسے تو اپنے آپ ہی پتہ چل گیا ہوگا۔ آج سویرے سے مجھے لگ رہا تھا وہ مجھ سے کوئی بڑی کھشی کی بات چھپا رہا، آؤ تمہارے بابا کو ساتھ لے جا کے آج ہی بیاہ کی تاریکھ پکی کر آندے ہاں۔'' اُس نے بیکل کی پیٹھ ایک بار پھر تھپکی۔ ''تم نے واکیائی کمال کر دکھایا اے پُترا۔ سر پھ سودا بیچ بیچ کے پورا آدمی خرید لیا اے۔ میری بہناں کھانکھا پکھر کرتی رہتی تھی، راستے میں لڈو بھی لے جاں گے۔ پَر ٹھہر جا پترا، میری آنکھوں میں بھائی ویر سنگھ گھومنے لگا اے —— مجھے جرا دم پکڑ لینے دے——''

(۵) ب

''عقل کے ناخن لو جالمے'' لالو بابا نے جالم سنگھ کو ٹوکا۔
اِک تمہارے گلت ملت پھارسی مادرے میرے سر پر چڑھ آندے ہیں للوا۔ اکل کا بھی کیا کوئی وجود ہے جو اُس کے ناکھن ہوں۔'' جالم سنگھ نے اپنا فیصلہ دہراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بتا دیا اے کے لڈوؤں کا تھال لے کے جائیں گے۔''

''ارے بھائی میرے، لڈو ابھی رہنے دو، ابھی صرف مل آتے ہیں۔ بات پکی کرنے دوسری بار چلے جائیں گے۔ اُس وقت تک محمد علی بھی اپنے سکول کے پکنک سے لوٹ آئے گا۔'' محمد علی بی اے کر لینے کے بعد وہیں ایک اسکول میں ٹیچر ہو گیا تھا۔

''للوا، اُسے ایک دم پتہ چلے گا تو وہ اور بھی خوش ہو گا۔''

گوراں چاچی بھی بات پکی کر لینے کی خواہش سے بے چین ہونے لگی۔

'' جالما ٹھیک کہتا ہے بابا۔ لڑکی اتنی اچھی ہے تو شبھ کام میں دیر کا ہے کو؟''

''اور جو گونگی بڑھیا نے انکار کر دیا تو۔''

''تو گونگی بڑھیا ہی تو ہے۔ہم اُسے یکین دلا دیاں گے کے وہ اپنی گوں گاں کو سمجھ نہیں ری اصلی میں اُس نے حامی بھری اے، پھر بھی وہ نہ مانی تو اُس کے پوپلے منہ میں جبر دستی اپنا لڈو ٹھونس دیاں گے ——''

مگر جب وہ گونگی بڑھیا کے یہاں بے اطلاع جا پہنچے تو وہ اپنے واہوں کے منہ میں روٹی کے نوالے ڈال ڈال کر اُسے اپنی غوں غاں میں یہی سمجھا رہی تھی، نہیں، واہوں، یہ کام لڑکے والوں کا ہے کہ وہ ہمارے گھر آکر بلو کا ہاتھ مانگیں۔

''واہو! وہوں!۔؟'' گونگی بڑھیا کے منہ لگے کتے نے اچھل اچھل کر اُس سے پوچھا۔

''غوں —— غاں —— غو! نہیں واہوں پتر، لڑکے کے ماں باپ کیوں نہ حامی بھریں گے —— غوں، بلو اور بیکل ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔ بلو نے مجھے بتا رکھا ہے کہ وہ آج کل میں ہی بات پکی کرنے آجائیں گے —— ارے آہستہ! —— اتنی جلدی کیوں کھا رہے ہو؟

''واہو! —— وہو! ——''

''بلو؟ —— مجھے کیا پتہ، کہاں ہے؟ بیکل کے ساتھ کہیں نہیں گئی تو چرچ میں فادر کے پاس ہو گی۔''

اتنے میں گوراں چاچی، لالو بابا، جالم سنگھ اور اُن کے پیچھے بیکل گونگی بڑھیا کے چبوترے میں آداخل ہوئے۔ بیکل کی آنکھیں چبوترے میں دوڑ دوڑ کر بلو کو ڈھونڈ رہی تھیں جو اسی اثنا میں چرچ سے لوٹ کر اُسی کے پیچھے چلی آرہی تھی۔ اُسے دیکھ کر جالم سنگھ نے ہنستے ہوئے گونگی بڑھیا سے کہا۔ ''دیکھو مائی، ہمارے ساتھ بلو بھی تم سے بلو مانگنے آئی ہے۔''

گونگی بڑھیا نے اپنی خنداں سی غوں غاں میں نامعلوم اُنہیں کیا جواب دیا۔

بلو نے مسکراتے شرماتے آگے بڑھ کر جھونپڑے کے سامنے اپنی دونو

چار پائیاں بچھادیں کے جن پر وہ ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ جالم سنگھ نے اپنی جگہ سے اُٹھتی ہوئی گونگی بڑھیا کے منہ میں پورا لڈو ٹھونس دیا۔

''ارے بھئی، پہلے پوری بات تو کرلو''۔

''گونگی بڑھیا تھوڑی بہری بھی ہے للوا۔ وہ اسی تراں سنتی اے۔''

گونگی بڑھیا لڈو کھاتے ہوئے ہنسنے لگی تو بوندی اُس کے منہ سے باہر اچھل آئی۔ واہوں نے بھی اپنی چار ٹانگوں پر کھڑا ہو کر منہ کھول لیا۔

''ہاں بھئی، لو تم بھی لو۔''

بابا لالو اپنی خوشی کو سہار نہ سکا اور گونگی بڑھیا کو مبارکباد دینے کے لئے بے اختیار اُس کی طرف بڑھ آیا اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لینا چاہا، جس پر گونگی بڑھیا لجا سے سرخ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور اپنے برف جیسے سفید سر کو پلو سے ڈھانپنے لگی تو یہی لگا کہ اُس کے سفید بالوں میں سیاہی بھر آئی ہے۔

جالم سنگھ نے اپنی قہقہاتی آواز میں کہا۔ ''نہیں، مائی، تم گلت سمجھی ہو، ہمارا للوا تمہیں اپنے لئے نہیں مانگنے آیا۔ اپنے بیٹے کے لئے تمہاری بیٹی مانگنے آیا اے۔''

لالو نے جالم کو ٹوکا۔ ''شرم کرو جالمے''۔

''گونگی بڑھیا کون سی سن رہی اے، اور سن بھی رہی اے، تو کیسے بتا سکتی اے کے اُس نے کیا سنا اے؟''

''نہیں جالمے،۔''

''نہیں کیا؟ واہگورو سے بھی میرا یہی جھگڑا ہے۔ جرا ہنسی مجاک کر لینے میں ہرج ہی کیا ہے؟''

اسی دوران چاچی گوراں بھی بلو کے پیچھے جھونپڑے کے اندر چلی آئی تھی جہاں بلو اُن کے لئے چائے تیار کر رہی تھی۔ گونگی بڑھیا بھی واہوں کو اُن کی دیکھ ریکھ کے لئے چھوڑ کر اُن کے پیچھے اندر آ گئی۔

''تم نے گھر بہت صاف رکھا ہوا ہے بیٹی''۔ گوراں چاچی نے اِدھر

اُدھر نظر دوڑا کر بلو سے کہا۔

''کچا گھر صاف ستھرا نہ رکھا جائے تو مٹی اڑتی رہتی ہے اماں۔''

گونگی بڑھیا نے اندر پہنچ کر سارے کام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو گوراں چاچی اپنی بہو کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ''جاؤ بیٹی، تم باہر جا کے بیٹھو، ہم دونوں چائے وائے دیکھ لیں گے۔''

''نہیں اماں، تم جا کے بیٹھو۔''

گوراں چاچی جانے لگی تو بلو نے جھجکتے ہوئے کہا۔''ایک بات کہوں، اماں؟''

''ایک کیوں، سو کہو بیٹی۔''

''میں سوچتی ہوں'' میں یہاں سے چلی گئی تو اماں اور واہوں دونوں گھل گھل کر مر جائیں گے۔''

''تمہاری اماں تو ہوئی، یہ واہوں کون ہے بیٹی؟''

''میرا بھائی۔''

''بھائی؟''

''ہاں، اماں''۔

اتنے میں واہوں بھی اندر آ گیا۔

''یہ واہوں، اماں۔''

''اچھا!'' گوراں چاچی ہنسنے لگی، ''ہمارا گھر بہت بڑا ہے بیٹی، تمہاری ڈولی میں ہم یہ دونوں بھی اٹھا لے جائیں گے۔''

بلو اپنی ساس کی طرف متشکر آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

''تم باہر جا کے بیٹھو اماں، ہم دونوں بھی چائے لے کر ابھی آتی ہیں۔''

(۵) ج

فادر ڈینیل بخش نے لاکھ زور لگایا کہ بلّو اور بکل کی شادی عیسائی ریتی رواج کے مطابق چرچ میں انجام پائے، پَر جالم سنگھ اَڑ گیا کہ وہ اپنے بکل کا بیاہ خود آپ گرنتھ صاحب کے روبرو گوردوارے میں کرائے گا۔

''اوئے میرے پیارے فادر، میری بات کان دھر کے سن۔'' جالم سنگھ فادر کو سمجھاتا رہا۔ ''تمہارا یسوع واہگورو کا ہی پتر ہے نا—— بول، ہے کہ نئیں؟ ہے!—— تو پھر اسے بھی اپنے واہگورو کے سامنے بیٹھ کے بیاہ کا نجارہ کرنے سے کیاؤں روکدے ہو؟—— کیسے پھادر ہو پھادر؟ باپ بیٹے کو مل بیٹھنے کا موکا مل ریا ہے تو اُنہوں کو مل بیٹھنے دو، کیاؤں اُن کی ملاخات میں روڑا اٹکاتے ہو؟——''

یہ اچھا ہوا کہ جالم کی بات آخر فادر کی سمجھ میں آ گئی اور اُس نے حامی بھر لی ورنہ جالم نے سوچ رکھا تھا کہ واہگورو کو ہی فادر کو منوانے کے لئے بھیجے گا۔

مگر جالم سنگھ کو معلوم نہ تھا کہ واہگورو اُس سے کچھ کہے بغیر خود آپ ہی فادر کے پاس جا پہنچا تھا۔ فادر نے ہی ایک دن جالم کو بتایا تھا، تم نے بڑی کٹھن سمَسیا کھڑی کر دی تھی، مگر تمہارے واہگورو نے خود آپ ہی آ کر ساری بات مجھے سمجھائی تو مجھے

پتہ چلا، کہ تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔

''اُس نے اچھا ہی کیا جو آپ ہی تمہارے پاس چلا گیا، میں ہمیشاں ٹھیک ہی کہندا ہوں، پر سمجھانا تو اُسی کا کام اے۔''

شادی سے پہلے جالم سنگھ اپنے واہگورو کی سکھ سنگت کے ایک ایک فرد کے پاس گیا ور اُس سے کہا کہ اگلے سارے مہینے کے گوردوارے کے چڑھاوے مجھے ابھی دے دو، میں اپنے پُتر کا بیاہ خوب دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ اُس نے دھوم دھام کا پورا بندوبست کیا۔ بیکل کا باپ تو بس مہمانوں کی طرح شادی میں شریک ہو گیا۔

شادی کے دن گوردوارے میں مہمانوں کو بٹھانے کی ذمہ داری جالم سنگھ نے اپنی بہن گوراں چاچی، لالو بابا اور محمد علی کے سپرد کی اور ڈولی والوں کو گونگی بڑھیا کے یہاں بھیج کر آپ بھی بیکل کے ساتھ وہاں جا پہنچا۔

مگر پاپا۔ ڈولی تو شادی کے بعد اٹھائی جاتی ہے۔

مگر پُترا، اُسے ایتھوں اٹھاؤ گے نئیں، تو شادی کیسے کرو گے؟

بِلّو سج دھج کر تیار بیٹھی تھی۔ پہلے اُسے ڈولی میں بٹھایا گیا اور پھر گونگی بڑھیا کو بھی، اور گونگی بڑھیا کے پیچھے واؤں بھی ڈولی میں گھسنے لگا تو جالم سنگھ نے اُسے باہر کھینچ کر کہا۔ ''مرد بچے ہو، تم کیاؤں ڈولی میں گھسے جا رہے ہو، ہمارے ساتھ پیدل چلو۔''

جالم اور بیکل اور واہوں ڈولی کے ساتھ گوردوارے لوٹے تو گوردوارے کا صحن مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ مہمان بیاہ کے پنڈال کے سامنے کچے صحن کی گھاس پر بیٹھے تھے اور اُن کے آگے ایک دری بچھی تھی جس پر فادر ڈینیل بخش اور مولوی منظور احمد اور بعض دوسرے معززین اور بزرگ براجمان تھے۔

جالم سنگھ نے دولہا دلہن کو پنڈال میں چوکیوں پر بٹھایا جہاں اُن دونوں کی ایک طرف بابا لالو اپنی بیوی کو کسی تیں پینتیس سال پہلے کی شادی کی تفصیلات بتا رہا تھا اور گوراں چاچی اُسے نہایت غور سے سننے کا بہانہ کئے اپنے بیٹے اور اُس کی دلہن پر ریجھے

جا رہی تھی، گونگی بڑھیا بھی پنڈال ہی میں بابا لالو اور گوراں چاچی کے سامنے تصویر سی بن کر بیٹھی تھی۔ واہوں نے گونگی بڑھیا کی پشت پر جگہ گھیر رکھی تھی اور اُس کے ساتھ ہی محمد علی بھی آ کھڑا ہوا تھا۔

جالم سنگھ نے بڑے فخر سے سینہ پھلا کر مہمانوں کی بھیڑ پر نظر دوڑائی اور پھر اپنے بعض خاص کارکنوں کو سادھ سنگت میں لڈوؤں کے لفافے بانٹنے کا اشارہ کر کے بیاہ کی رسم ادا کرنے کے لئے دولہا دلہن کے سامنے پنتھی کی چوکی پر سج گیا۔

بابا لالو نے تجویز کیا کہ لڈو بانٹنے سے پہلے بیاہ پڑھ لیا جائے۔

''نہیں للوا، میں چاہتا ہوں بیاہ کے ساتھ ساتھ لوگ منہ میٹھا کرتے رہیں۔''

اپنا پاٹھ شروع کرنے سے پہلے جالم سنگھ نے فادر اور مولوی کو آواز دے کر پنڈال میں آجانے کو کہا اور جی ہی جی میں پنڈت کو کوسنے لگا کہ ہر شبھ اَو سر پر بیمار پڑ جاتا ہے۔ فادر نے وہیں سے اشارہ کیا کہ وہ بڑے مزے سے بیٹھے ہیں اور وہ اپنا کام اب شروع کر دے۔

جالم سنگھ نے واہگورو کا اشارہ پا کر گرنتھ صاحب کے کھلے پنوں سے شلوکوں کو منہ میں لے لیا۔ واہگورو نے اُسے شاید اِتنا تیز پڑھنے سے روکنا چاہا مگر اُس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو بتایا کہ تیز نہیں پڑھوں گا تو دواہت جوڑا کیا اپنی سہاگ رات بھی یہیں پنڈال کی چوکیوں پر بتائے گا؟ گھنٹوں کا کام منٹوں میں سمٹ گیا اور دولہا دلہن اپنی چوکیوں سے اٹھ کر اُس کے پیر چھونے کے لئے جھک گئے اور اُنہیں اپنے پیروں پر اس طرح جھکا ہوا دیکھ کر اُس کے منہ میں دعائیں ہی دعائیں بھرتی چلی آئیں، کچھ ایسے اور اِتنی، کہ دولہا دلہن اور ان کے ماں باپ اور سبھی دوسرے لوگوں کے چلے جانے کے گھنٹوں بعد بھی وہ گوردوارے میں اٹھتے بیٹھتے اُنہیں بدستور ویسے ہی اپنے پیروں پر جھکا ہوا دیکھتا رہا اور اُس کے منہ سے آپ ہی آپ دعاؤں کی پھوار ہوتی رہی۔ رات کو اپنا کھانا تیار کرنے کی بجائے وہ کھاٹ پر لیٹے لیٹے لڈو کھاتا رہا اور لڈو کھاتے

کھاتے آپ ہی آپ ہنستا رہا۔ اور تعجب ہے کہ اِس پھوار میں کھلکھلاتے ہوئے وہ بھائی ویر سنگھ کو بھی بھولے رہا اور بھولے بھولے وہ کچھ ایسا نیا نویلا ہو گیا، مانو اُس کا کوئی آگا پیچھا نہ ہو اور وہ جو بھی ہو، ابھی اور اِسی وقت ہو، اور یہ لمحہ گزرنے کے بعد پھر ابھی اور اِسی وقت۔ پھر ابھی اور اِسی وقت، مگر جب ہم آپ یادداشت کھو بیٹھیں تو ہماری یادداشت بھی ہماری تلاش میں نکلی ہوتی ہے۔ بھائی ویر سنگھ کو بھی وہ اچانک یہاں پھوار میں دِکھ گیا اور پھر ——؟ پھر اُسے جیسے سانپ سونگھ گیا اور وہ گم سم پڑا رہا اور خلاف عادت تھوڑی دیر میں معمول میں لوٹ آنے کی بجائے ویرانے کے مزید اندروں ہولیا جہاں اُس کی بیمار اور بیوہ ماں —— نہ جانے کون سی ماں —— بے علاج دم توڑ رہی تھی اور وہ —— نا معلوم کب کا وہ —— اپنی ماں کے سر پر اپنا ننھا سا بے بس ہاتھ رکھے رو رہا تھا۔ جالم سنگھ ہڑبڑا کر نیند سے جاگ پڑا۔ نہیں، جاگ کیا پڑا، وہ سو رہی تھی اور اپنی معصوم آنکھوں سے دم توڑتی ہوئی ماں کو دیکھ رہا تھا، یا شاید اُس کی ماں دم توڑ چکی تھی۔ وہ ذرا سا تھا اور اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اس کا واہگورو گھبرا کر اُس کے کمرے میں دوڑا دوڑا آیا—— کیوں، کیا ہوا جالمے؟—— جالمے۔

(٦)

جب سے بابا بہو گھر لایا تھا، اُس کا گھر بھر گیا تھا، خوشیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے تھے، جن کے باعث قدم قدم پر ٹھوکر سی کھا کر گھر کے باسیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا جانا اچھا لگتا تھا۔

''سنبھل کے، بی بی''

''سنبھل سنبھل کے اب مجھے کہاں جانا ہے بابا؟ بڈی وڈی تو ڑ بھی بیٹھی تو جیسے ہے ویسے ہی گھر میں کھاٹ پر پڑی رہوں گی۔''

''نہیں بی بی، یوں تو تم کھاٹ پر دِکھنے سے رہی۔ میں کہتا ہوں اب سارا کام دھندا بہو کے سپرد کیوں نہیں کر دیتیں؟''

''کام دھندا تو اب اُسے ہی کرنا ہے، پَر اُس کی شادی ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔''

''تم تو مہندی والے ہاتھوں سے بھی برتن مانجھا کرتی تھیں۔''

''نہ مانجھتی، بابا، تو برتنوں کی چمک دمک کیسے بنی رہتی؟''

بابا لالو کھاٹ پر اُس کے قریب کھنچ آیا۔ ''ہمیں کالے پانی کی سزا ہی



اس لئے ملی تھی کہ ہمارے برتن چمکتے دھمکتے رہیں——"

دونوں چمکتے ہوئے پرانے برتن ایک دوسرے سے ٹکرا کر نو بہ نو بج اٹھے۔

"ایک بات پوچھوں، بی بی؟"

"ایک کیوں، دس پوچھو بابا۔"

"ہاں، بی بی، میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ دس باتیں پوچھ کر بھی یہی خیال آتا ہے کہ پوچھنی تو گیارہویں تھی۔ تو سنو، بی بی، میری گیارہویں بات یہ ہے کہ شادی کر کے ہم نے گھر بار بھی بنالیا ہے اور پھول جیسی بہو بھی لے آئے ہیں اور ہمارے علی نے ماشاء اللہ ایل ایل بی میں داخلہ بھی لے رکھا ہے اور نوکری بھی کر رہا ہے——"

"یہ سب کچھ ہم بار بار ایک دوسرے کو بتا چکے ہیں، پہلے اپنی گیارہویں بات پوچھ لو۔"

"پوچھنا میں یہ چاہتا ہوں بی بی، اگر تم مجھ سے بیاہ نہ کرتیں تو کیا کرتیں؟"

"ہت تیرے کی! میں تو گھبرا گئی تھی۔ تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو میرے بابا، جیسے ہمارا بیاہ ابھی ہونا ہو اور تمہیں ڈر ہو کہ میں کہیں نہ نہ کہہ دوں۔"

"ہاں، بی بی، مجھے اب بھی یہی لگتا ہے کہ بڑا سہانا سپنا دیکھ رہا ہوں اور تم کہیں نہ کہہ کر میرا سپنا جھٹک نہ دو۔"

"پر میرے بابا، ہم تو گلے مل کر بوڑھے بھی ہو لئے ہیں۔" وہ آج بھی دن میں دو ایک بار گلے ملنے کا حیلہ ضرور ڈھونڈ لیتے تھے۔

"تو آؤ، پہلے مجھے بازوؤں میں لے کر زور سے بھینچ لو۔"

"نہیں، بابا، تمہارے پھیپھڑے دَب وَب گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ارے نہیں، ہٹو!"

''ہٹو وٹو کیا؟——''

اتنے میں ہی گونگی بُڑھیا بھی بناوٹی غصے میں غوں غیاتی ہوئی اُن کے کمرے میں آ دھمکی، جس پر وہ یکلخت ایک دوسرے سے الگ ہو کر چارپائی پر دور دور بیٹھ گئے۔

گونگی بڑھیا نے ذرا سر جھکا کر اپنے پیچھے اشارہ کیا جہاں دروازے سے واہوں بھی داخل ہو رہا تھا۔

گوراں چاچی اب گونگی بڑھیا کی زبان کو سمجھنے لگی تھی۔ ''وہ شکایت کر رہی ہے بابا کہ واہوں بھی کھاٹ پر اُس کے ساتھ سونے کی ضد کر رہا ہے۔''

''غوں غو——غاں——!——''

''اور میں ابھی ابھی نہا دھو کر ذرا لیٹی ہوں۔''

''تو کیا ہوا؟'' لالو بابا نے ہنس کر کہا۔ ''آؤ واہوں، تم ہماری کھٹیا پر لیٹ جاؤ۔''

''غاں غوں——غو!۔''

''تم نے ہی واہوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے بابا۔''

واہوں اچھل کر بابا کی کھاٹ پر چڑھ آیا اور گونگی بڑھیا ویسے ہی غوں غیاتی ہوئی الٹے پاؤں اپنی دیوڑھی کی طرف لوٹ گئی۔

بابا کے گھر کی دیوڑھی بہت بڑی تھی اور اُس نے وہیں ایک دیوار کھڑی کر کے گونگی بڑھیا اور واہوں کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ بنوا ڈالا تھا۔ بابا نے اپنا گھر اب ڈھائی منزل اوپر تک چڑھا لیا تھا۔ نیچے وہ خود آپ دونوں اور گونگی بڑھیا اور واہوں رہتے تھے، درمیانی منزل پر بکل سنگھ اور اُس کی بیوی اور اوپر کے واحد کمرے میں محمد علی اپنی کتابوں میں کھوئے فکر و بنیش کے کسی نومعلوم جزیرے کی سیاحت پر نکلا ہوتا تھا۔

بالی عمر میں بڑا ہنسوڑ اور کھلنڈرا تھا اور اندھا دھند اِدھر اُدھر دوڑا پھرتا

تھااور اُس کے ساتھ اِس ڈر سے دوڑ دوڑ کر اُس کی ماں کا دم پھولا رہتا تھا کہ گر نہ جائے۔

مگر پانچویں جماعت تک آتے آتے ہی وہ بڑا سنجیدہ نکل آیا اور اپنی پڑھائی میں اِتنا مگن رہنے لگا تھا کہ اُسے کتابوں کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہ تھا۔ بی، اے، کے بعد اپنی اسکول ٹیچری کے ساتھ اُس نے ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایل ایل بی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہمعصر ہندوستانی، قانونی عمل کے بے ڈھنگے پن پر اُس کی سنجیدگی میں اکثر غصہ بھر آتا اور اپنے کالج کی بحثوں میں وہ بیشتر ایسے سوال اٹھایا کرتا جن سے یہ پوچھنا مطلوب ہوتا کہ ہمارا انصاف کا عملی معیار گھٹ گھٹ اِس سطح پر کیوں آ گیا ہے کہ مجرموں کی جرم کی ترغیب کا اسباب ہوتا رہے اور غیر مجرم جرم کے ارتکاب کے بغیر اپنا دفاع نہ کر پائیں۔

علی اپنے اسکول کے انگریز پرنسپل پٹ سن کا بڑا چہیتا تھا۔ پٹ سن نے بھی قانون میں ڈگری لے رکھی تھی، وہ اُس کی ایل ایل بی کی تیاری میں بخوشی مدد کرتا تھا اور اکثر اُس کی بحثوں میں شامل ہو کر اُس کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے پوچھتا، تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ غیر مجرم جرم کے ارتکاب کے بغیر اپنا دفاع نہیں کر پاتے؟

''ایسے، سر، وہ ہو بہو سچ بول رہے ہوتے ہیں تو موجودہ سسٹم میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جرم کا اقبال کر رہے ہیں۔ ہمارے قانون میں گیم پلان کی بہت گنجائش روا رکھی گئی ہیں سر۔ جو پکڑا نہ جائے، وہی بے گناہ، چنانچہ جیسے بھی بنے، پکڑے نہ جاؤ۔''

''لیکن مائی ڈیئر بوائے، جو سچ بول رہا ہو، اُس کا کیا پکڑا جائے گا؟''

''سچ، سر، سچ ہی، جس کی سزا وہ ساری زندگی بھگتتا رہے گا۔''

پٹ سن اپنے نوجوان شریک کار کی دلیل کو بخوبی سمجھتا تھا، تاہم اُسے یہ بھی پسند نہ تھا کہ اُس کے اتنے ذہین شاگرد کا اعتقاد ہی قانون پر سے اٹھ جائے۔ ''اِس کا علاج یہ ہے کہ سوسائٹی کا اخلاقی معیار بھی لا اینڈ آرڈر کے کارگر نفاذ کا اہل ہو ———

نہیں، ٹو کو نہیں۔ مجھے معلوم ہے اِس کا جواب تم یوں دو گے کہ جن لوگوں کا اخلاقی معیار بلند ہوتا ہے اُن کی زندگی لا اینڈ آرڈر سے ترتیب نہیں پاتی بلکہ لا اینڈ آرڈر اُن کی زندگی سے ترتیب پاتا ہے، مگر میرے نوجوان دوست، لا اینڈ آرڈر کو بالذات تسلیم نہ کیا جائے تو جنگل راج شروع ہو جاتا ہے۔ ہماری تہذیبی بقا کے لئے سزا کا خوف لازم ہے۔''

''نہیں، سر، خوف کسی بھی برتر تہذیب کے منافی ہے۔''

پرنسپل پِٹ سن کا باپ ایک پکا کولونیل تھا جس نے ساری زندگی انڈیمان کی انگریزی سرکار کی نوکری میں بِتائی تھی۔ پِٹ سن بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ یہیں اونچا ہوا تھا اور یہاں کی زندگی اُسے اتنی راس آئی تھی کہ انگلینڈ سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آٹھویں دہے میں اُس نے ہندوستانی شہریت لے کر یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔

پِٹ سن اپنے آپ کو سو فیصد ہندوستانی قرار دیتا تھا۔ وہ اپنی ہندوستانی بیوی سے کہا کرتا تھا کہ وہ غلطی سے انگریز ماں کی کوکھ میں آ پہنچا، آسمانوں سے نکلا وہ اِسی نیت سے تھا کہ کسی ہندوستانی کے یہاں پیدا ہو۔ اُسے اپنی بیوی ششی سے اس لئے بھی محبت تھی کہ وہ اُس کی بیوی ہے اور اس لئے بھی، کہ وہ ہندوستانی ہے۔ ششی ایک سیاسی قیدی جگن ناتھ کی بیٹی تھی۔ جگن ناتھ نے اپنی لمبی قید کی معیاد پوری کر کے یہیں بس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اُس نے ایک پڑھی لکھی بنگالی عورت سے شادی کر لی تھی۔ وہ بھی اپنی بعض سیاسی مصروفیات کے باعث عمر قید پر یہاں بھیج دی گئی تھی۔

''میری ماں''، ششی اپنی خوبصورت آنکھوں میں پانی بھر کر پِٹ سن کو بتایا کرتی تھی۔ ''تم سوچ بھی نہیں سکتے رابی، کہ میری ماں کتنی خوبصورت تھی ــــــ''

پِٹ سن اپنی بیوی کی بھیگی آنکھوں کو بے اختیار چوم لیتا۔ ''تمہاری ماں جیسی بھی تھی، میرے معزز سسر کے لئے تھی، میرے لئے تو تم ہی دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہو۔''

وہ پھر اُس کی آنکھیں چومنے کے لئے اُس پر جھک آتا، مگر ششی شرما کر

اُسے ہولے سے پرے ہٹا دیتی، جس پر پِٹ سن اور بھی لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

پِٹ سن اور ششی کی شادی کو پچیس برس سے بھی اوپر بیت چکے تھے، مگر اُن کے یہاں ابھی تک کوئی بچہ نہ ہونے کے باعث ششی بہت اداس رہتی تھی۔

''جن کے یہاں محبت کرنے کی اتنی زیادہ صلاحیت ہو'' ۔پِٹ سن اپنی بیوی کو سمجھایا کرتا۔ ''جتنی تم میں ہے، گاڈ آل مائٹی اُنہیں اِس لئے بچہ عطا نہیں کرتا کہ دنیا بھر کے بچے اُنہی کے تو ہیں۔ جسے چاہا، اُسے گود میں لے کر کھلا پلا دیا، جسے چاہا، لوری سنا سنا کر سلا دیا، جسے چاہا، سجا کر اسکول بھیج دیا، جسے ——''

''بس! بس! اپنی گردان سے باہر آجاؤ، میں سمجھ گئی ہوں۔'' ششی کو اپنے شوہر سے شکایت تھی کہ فالتو باتیں کرتے ہوئے وہ عادتاً کلاس روم لیسن کا سماں باندھنے لگتا ہے۔ ''آؤ اب تمہیں تیار کر دوں۔ اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' اُسے ٹائی دیتے ہوئے وہ رک جاتی ہے۔ ''میں تو تمہیں بھی سینے سے لگاتی ہوں رابی، تو ممتا سے میری چھاتیاں پھول جاتی ہیں''۔

''جلدی کرو میری ماں، اسکول سے واقعی دیری ہو رہی ہے۔''

پِٹ سن کے یہاں علی کا بہت آنا جانا رہتا تھا۔ اُس کے وِزِٹ میں تاخیر واقع ہونے لگتی تو ششی اپنے شوہر کے ذریعہ کہلوا بھیجتی، ممی کے آلو پکوڑے کھانے نہیں آؤ گے؟''

ششی علی کو اپنے بیٹے کی طرح ہی دل و جان سے پیار کرتی تھی اور علی بھی اُسے بہت چاہتا تھا، یہاں تک کہ بابا اُس سے ہنس کر کہا کرتا، دیکھو بھئی، ششی جی کا بیٹا بننا تو تم نے قبول کر لیا، مگر پِٹ سن کو بھی اپنا باپ بنا لو گے تو میں تم دونوں پر عدالت میں دعوے ٹھونک دوں گا۔

میرا بیٹا بڑا لائق لڑکا ہے۔ اپنے بیٹے کی تعریف کرتے ہوئے بابا کو اور کوئی سوجھتا ہی نہ تھا —— بولتا ہے تو اُس کے منہ سے کتابیں جھڑنے لگتی ہیں۔

''جے بھی ٹھیک ہے للوا۔'' جالم سنگھ اُسے اپنے لمبے چوڑے بیان سے

پہلے ہی ٹوک دیتا تھا۔ ''پر کسی میں کوئی گن ہوتا ہے اور کسی میں کوئی۔ میرے بیکلے کو دیکھو۔ چار دن میں اُس نے تمہاری چھوٹی سی نون تیل کی دکان کو کہاں سے کہاں پونچا دیا۔ وہ بھی بولتا ہے تو اُس کے منہ سے اتنا بڑا پر ووِجّن شتو رجھڑ نے لگتا ہے۔''

''تم دونوں کے بیٹے بڑے لائق ہیں بھائی۔'' گوراں چاچی اُن کے درمیان آ کھڑی ہوتی۔ ''پر جالما، مجھے ایک ہی دُکھ کھائے جاتا ہے، ہمارا علی کبھی کُھل کر ہنستا نہیں۔''

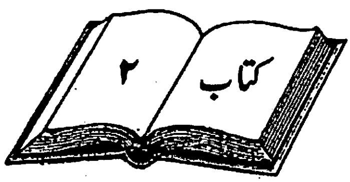
''اوئے بہناں، گھابرو ئیں۔ کتاباں پڑھن والے بڑے بڑے گورو بھی بس اِک کُھل کے ہسدے نئیں تھے۔''

''ہاں ہنستا تو ماسٹر اللہ دتا بھی بہت کم تھا'' لالو بابا نے اپنے دوست سے اتفاق کیا۔ لو، تمہیں اللہ دِتا کی ایک کہانی سناتا ہوں۔''

''نئیں۔ للوا، بات ہمارے بچڑوں کو ہوری ہے اور کانی تم اپنے اللہ دِتا کی لے بیٹھے ہو۔ وہ کانی میں پھیر کسی وخت سن لوں گا۔''

''تو پھر اس وقت تمہیں کیا سناؤں؟''

اِس وخت تو مجھے پاٹھ لئی اپنے واہگورو کے گھر پونچنا ہے۔ وخت پر نہ پونچا تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گا۔''


کتاب ۲

(۱)

قصوں والی گلی کے تقریباً سارے گھر کچھ اِس طرح سٹے ہوئے یا آمنے سامنے ہیں گویا ساری گلی میں ایک ہی کنبہ بسا ہوا ہو۔ بابا لالو کی دائیں طرف بلیا کے ڈاکے والے کا گھر ہے اور بائیں طرف باؤلی دادی کا اور سامنے کے بڑے مکان میں کالے خان کا خاندان رہتا ہے۔ کالے خان کے بارے میں مشہور ہے کہ سال میں دو ایک بار اُس کا بھوت ابھی تک نصف شب کو اپنے مکان کی چھت سے بندوق کے دو چار فائر ہوا میں چھوڑتا ہے۔

کالے خان ملک کی آزادی سے کچھ عرصہ پہلے ہی قید سے رہا کر دیا گیا تھا اور رہائی کے بعد یہیں پورٹ بلیئر میں ہی رہنے لگا تھا۔ اُس نے یہ اعلان کر کے ایک بندوق خرید لی تھی کہ بندوق رکھنا اور چلانا ہر پٹھان کا پیدائشی حق ہے۔ وہ تو بعض معززین نے کہہ سُن کر اُسے لائسنس دلوا دیا تھا، وگرنہ وہ لائسنس کو بھی اپنی شخصی آزادی میں روڑا سمجھتا تھا ——— خو ——— اپنی اور مظلوموں کی حفاظت میں بندوق چلانے کا حق اللہ کی دین ہے اور صرف اللہ ہی یہ حق واپس لے سکتا ہے۔

مگر ———

خو——اگر مگر میں چنگا بھلا آدمی بھی کافر ہو جاتا ہے۔

کالے پانی کی سزا سے پہلے کالے خان افغانستان کی سرحد سے جڑے ہوئے برٹش انڈیا کے ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھا اور اُس کا افغانستانی علاقے میں ہر روز اِس طرح آنا جانا تھا گویا دونوں ملکوں کے درمیان کوئی سرحد واقع نہ ہو۔ اُن دنوں انگریز فوجیوں کے سر پر افغانوں کی سرکوبی کا بھوت سوار تھا۔ اِسی زمانے میں کالے خان کو سرکار نے کسی ہنگامی مار پیٹ میں ملوث پا کر سال بھر کے لئے پشاور کی جیل میں بھیج دیا اور وہیں اپنی قید کے دوران انگریز جیلر کو ایک بے قصور قیدی کو ٹھوکر مارتے ہوئے دیکھ کر جب کالے خان سے رہا نہ گیا اور اُس نے جیلر پر قاتلانہ حملہ کر دیا تو اُس پر ایک خطرناک جرائم پیشہ انقلابی ہونے کا الزام تھوپ دیا گیا اور اُسے کالے پانی کی سزا ہوئی۔

بابا لالو کالے خان کی کہانیاں سنا سنا کر اپنے جانکاروں کو بڑی سادگی سے اس پوائنٹ پر لے آتا ہے کہ بعض مجرمین کتنی معصومیت سے جرم کے مرتکب ہو لیتے ہیں، اُس کا بیٹا علی بھی اِس مسئلے کی انسانی باریکیوں میں اتر اتر کر ماہرین قانون کو یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ ایسے مجرمین کو حتمی طور پر مجرم قرار دینا انصاف پر مبنی نہیں۔ مگر اپنی سوچ کے جذباتی اور فکری نتائج کے یکساں پن کے باوصف اگر اس موضوع پر باپ بیٹے کے درمیان بحث کی کوئی صورت نکل آتی ہے تو بوڑھا اپنے بیٹے کی فکری کشادگی پر جہاں خوش ہوتا ہے وہیں کشادگی کے ممکنہ خطرات کے باعث ذہنی تناؤ میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے اور شاید اِسی لئے اُسے اُس کی انحرافی بے چینیوں کی ترمیم کی فکر ہونے لگتی ہے، مگر علی اپنے باپ کے تامل اور تحفظ کو ہنس کر ٹال جاتا ہے، آپ فکر مت کیجئے بابا، بس ذرا انتظار کیجئے۔

''انتظار؟——''

''اِس بات کا، بابا، کہ میں کب مروجہ قانون کو پھانسی پر چڑھا پاتا ہوں۔''

''مگر بیٹا علی ـــــ''

''یا پھر اگر آپ چاہتے ہیں تو میں ہی پھانسی پر لٹک جاؤں گا۔''

اپنے بیٹے کو بڑے تحمل سے ہنستے ہوئے دیکھ کر بابا لالو کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے اور وہ سوچتا رہ جاتا ہے، میرا بیٹا کتنا نادان ہے، کتنا سمجھدار!

کالے خان کا بیٹا عمران بھی اپنے مرحوم باپ کے قصے سن سن کر یہی سوچتا ہے کہ اُس کے باپ نے بے سبب اپنی زندگی خود پر بھاری کر رکھی تھی۔ اتنی لمبی قید کاٹنے کے بعد بھی سرکاری کلرک سے ناحق جھگڑا مول لے لیا۔

''نہیں عمران بیٹا''۔ بابا لالو عمران کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ تمہارا باپ دراصل بڑا اصلح کوش انسان تھا، مگر نہایت غیور تھا۔ کلرک جب گالی گلوج پر اتر آیا تو وہ برداشت نہ کرسکا۔''

''نہیں، چچا بابا۔'' اس میں کلرک پر گولی داغ دینے کی کیا تک تھی۔ کلرک کی بھی جان لے لی اور خود بھی پھانسی پر چڑھ گیا۔''

''پٹھان بچہ تھا بیٹے۔ اِسی لئے تو مرنے کے بعد بھی ٹھاٹھا کرنے آنکلتا ہے کہ اُس سے بے انصافیاں نہیں دیکھی جاتیں۔''

''وہ کہاں آتا جاتا ہے چچا بابا۔ لوگوں کے کان بولتے ہیں۔''

''کان بھی اِس لئے بولتے ہیں کہ لوگ اُس پر جان دیتے ہیں۔ تم تو اُس وقت اِتنے سے تھے، تمہیں کیا معلوم، اُس کے جنازے میں ماتمیوں کا کتنا بڑا انبوہ شامل تھا۔ اتنی بھیڑ تو ولیوں کے جنازے میں بھی جمع نہیں ہوتی۔''

''اِس کی بجائے وہ چند روز اور چین سے زندہ رہ سکتا تھا چچا بابا، تو ہم سب کتنے خوش ہوتے۔''

ہاں بھئی، ہاں۔'' بابا لالو نئے لوگوں کو کالے خان کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کرتا ہے۔''اُس کا حق تو یہی تھا کہ قید و بند کے مصائب کے بعد اُسے سکون کی زندگی نصیب ہوتی، مگر بیقرار روحوں کو مر کر بھی چین کہاں نصیب ہوتا ہے۔ اللہ اُسے

کروٹ کروٹ جنت بخشے، ہر کسی کی آگ میں کود پڑتا تھا——"

عمران پورٹ بلیئر کے واحد سائنس کالج میں فزکس کا پروفیسر ہے اور اپنے طلباء کو یہی سمجھاتا رہتا ہے کہ سائنس پڑھ لینے سے نہیں آجاتی۔ سائنس سیکھنا ہو تو سائنسی طور طریقے سے جینا بھی سیکھو۔ بابا لالو سبھی کو بڑے فخر سے بتایا کرتا ہے کہ ہمارا بیٹا کمال کا سائنس داں ہے۔ امریکہ اور یورپ تک سائنس پر لیکچر دے آیا ہے۔ وہاں کے بڑے بڑے گورے سائنسداں بھی اُس کی دعوت پر اُس کے کالج میں آتے رہتے ہیں۔

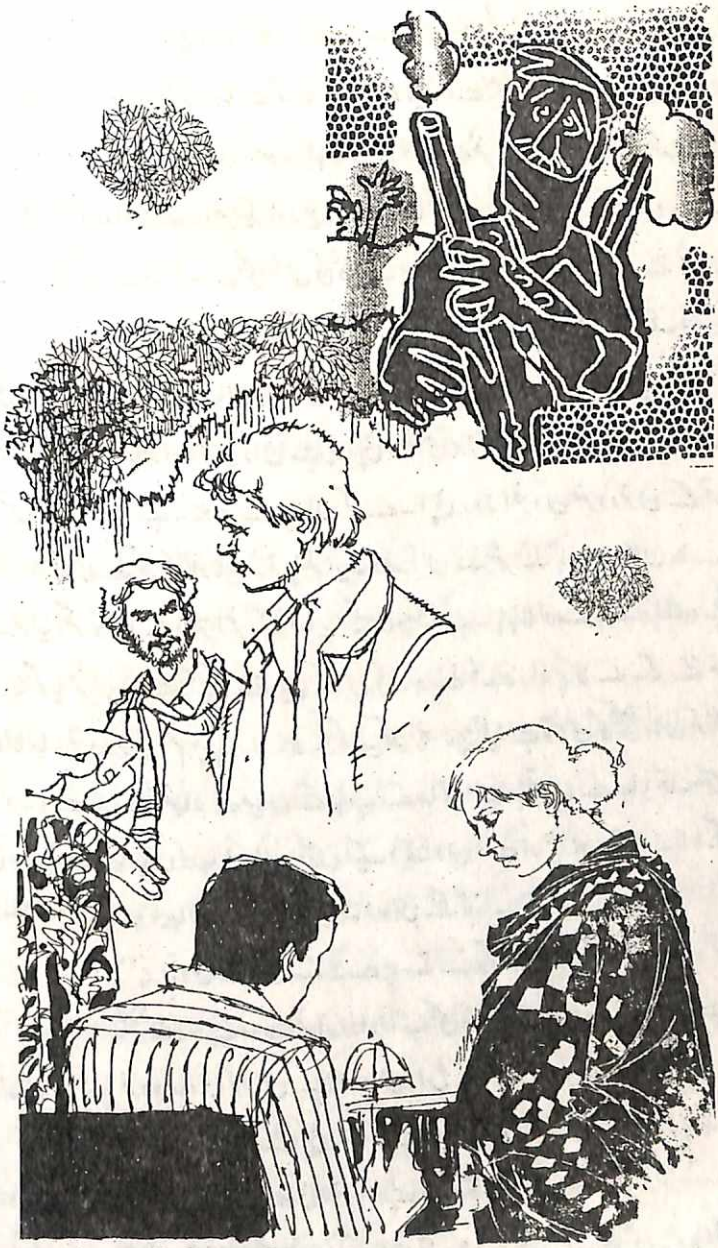
عمران کی ماں خدیجہ کی عمر اسّی سے بھی اوپر ہو چکی ہے مگر ابھی تک اُس کی کاٹھی ڈھیلی نہیں پڑی ہے۔ ماں کے تعلق سے عمران کی فرماں برداری پر لالو بابا عش عش کرتا رہتا ہے۔ اتنا بڑا سائنس دان ہے پَر اپنی عام سی بوڑھی ماں کی چاہ میں اپنی ساری سائنس بھول جاتا ہے۔ جو کرے سو ماں کرے۔ اپنی روز افزوں ضرورتوں کے تحت قصوں والی گلی کے گھر کو چھوٹا پڑتے پاکر ایک دفعہ اُس نے شہر کے باہر نیا مکان بنانے کا فیصلہ کر لیا، مگر بُڑھیا نے اعتراض کیا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بابا لالو کے ہاتھ ہوا میں ملتے ہوئے گویا عمران کی پیٹھ تھپکنے لگتے ہیں۔ اُس کی بہو نے اُسے راہ پر لانے کے لئے منہ کھولنا چاہا تو وہ بولی، تم چپ رہو بہو۔ اگر یہ گھر چھوٹا پڑ گیا ہے تو اِسی کو کھینچ تان کر کھلا کر لو۔ اِسے میں نے تمہارے میاں کے باپ کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یہیں میں نے تمہارے میاں کو پیدا کیا اور یہیں ایک ایک دن اُسے اونچا ہوتے ہوئے دیکھا کی—— نہیں بہو، یہاں سے نکلا تو میرا جنازہ ہی نکلے گا"۔

"پَر دادی۔" اُس کے بڑے پوتے نے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں، بیٹے، وہ جو تمہارا دادا اب بھی ٹھا ٹھا کرتے ہوئے آ دھمکتا ہے، ہمیں یہاں نہ پاکر وہ ساری گولیاں اپنے اوپر ہی داغ لے گا۔"

فرمانبردار بیٹے نے اپنی ماں کو بے چین پاکر فوراً اپنا فیصلہ قطعی طور پر بدل لیا اور اُسے یقین دلایا کہ جیسے تم چاہو گی امی، ویسے ہی ہو گا۔

عمران کی ماں بھی خون کے جرم میں کالے پانی بھیجی گئی تھی۔ وہ ابھی



چودہ پندرہ سال کی ہی تھی کہ رامپور کے ایک تھانیدار نے اُس کی ماں کی آبروریزی کرکے اُسے ہمیشہ کے لئے سلا دیا تا کہ وہ منہ نہ کھولے، عمران کی ماں اُسی عمر میں دہشت گرد باغیوں کی ایک جماعت میں شامل ہوگئی اور اُس وقت تک دم نہ لیا جب تک تھانیدار کا صفایا نہ کر دیا۔ کالے خان نے اُس کا قصہ سن کر اُسے کلیجے سے لگا کر کہا تھا ''خوتم اُدھر رامپور سیتاپور میں کیسے پیدا ہوگیا۔ تم تو خالص پٹھان ہو، میرے ہونے والے پٹھان بیٹے کی ماں ـــــ خو میرے لئے ایک ایسا بیٹا جنو جس کے نام کی ٹھاٹھا ساری دنیا میں سنائی دے''۔

خدیجہ رو رو کر کہا کرتی ہے، مرنے والے کو کیا پتہ، کہ اُس کے بیٹے کے نام پر کالا پانی جگمگا اٹھا ہے۔

عمران سے اپنی ماں کا رونا نہیں جھیلا جاتا ہے۔ اُس کے باپ کی پھانسی کے بعد خدیجہ نے اُس میں لحظہ لحظہ سانس پھونک کر اُسے بڑا کیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے پرانے دکھ سکھ یاد کر کے رونے لگتی ہے تو عمران آہستہ آہستہ اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے گویا اُسے کھل کر رو لینے کی ترغیب دے رہا ہوتا ہے۔ کالے پانی میں بہت بارش ہوتی ہے لیکن مینہ تھم جاتا ہے تو گیلے گیلے سورج کی دودھیلی روشنی میں ناچنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ کالے خان کے گھر سے بچوں کا شادماں شور وغل سن کر گوراں چاچی اپنا کام روک لیتی ہے اور لالو بابا کو متوجہ کر کے کہتی ہے ـــــ سنو بابا، کالے خان کے دو پوتے دو ہتے انگریزی دھنوں پر ناچ رہے ہیں۔

''ہاں، بی بی، اللہ سب کو خوش رکھے!''

بابا لالو کے مکان کی بائیں جانب کی باؤلی دادی کو ہر کوئی دادی کے نام سے ہی جانتا ہے۔ اُس کے بڑے بھی دادی کو دادی ہی کہتے ہیں اور چھوٹے بھی۔ چڑھتی جوانی میں ہی اُسے کالے پانی بھیج دیا گیا تھا۔ دادی اُس وقت اتنی خوبصورت تھی کہ اُسے دیکھتے ہوئے دل چاہتا تھا کہ ہر گناہ سے توبہ کر لی جائے۔ چہ جائیکہ وہ خود آپ کسی گناہ کی اہل ہوتی۔ نا معلوم کس جرم کی سزا میں اُسے یہاں بھیجا گیا تھا۔

جب تک باؤلی دادی کی سزا کی مدت پوری ہوئی، اُس وقت تک وہ اپنا ذہن کھوچکی تھی۔ کالے پانی پہنچنے سے پہلے گھر میں ایک وہ تھی اور ایک اُس کی ماں۔ الہ آباد میں دونوں اکٹھا رہا کرتی تھیں۔ سزا ملنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد جب اُسے خبر ملی کہ اُس کی ماں بھی الہ آباد سے اگلے جہاں جاپہنچی ہے تو پہلے تو اُس نے اطمینان کی سانس لی کہ چلو، زندہ نہ رہی تو دکھی کیوں کر رہے گی، مگر پھر چند ہی روز میں اُس نے اپنا ذہن کھونا شروع کر دیا اور پوری طرح کھودینے پر اُسے معلوم ہونے لگا کہ وہ بدستور اپنی ماں کے ساتھ الہ آباد میں رہ رہی ہے۔

انگریز جیلر باؤلی دادی کے پاگل پن سے بے خبر نہیں تھا۔ پھر بھی اُس کی ہدایت پر دادی سے پوچھ لیا گیا، واپس جاؤ گی یا یہیں رہو گی؟

''واپس کہاں؟ میں اپنی ماں کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گی؟''

اتفاق سے لالہ چھبیل داس کی سزا بھی اُسی دن پوری ہوئی تھی۔ اُس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ اپنی آزادی کے بعد پورٹ بلیئر میں ہی مستقل رہائش اختیار کرے گا اور دادی کو اپنے ساتھ ہی رکھے گا۔ اِس تعلق سے اُس کی درخواست کی سرکاری منظوری میں اس لئے دقت پیش نہ آئی کہ ہندوستانی مردوں کے مقابلے میں عورتیں وہاں بہت کم تھیں اور کرائم کی روک تھام کے لئے سرکار یہی چاہتی تھی کہ نہ صرف سزا یافتہ عورتیں یہیں رہ جائیں بلکہ سزا یافتہ مرد اپنی مین لینڈ کی عورتوں کو بھی یہیں بلا لیا کریں۔ انگریز جیلر نے ایک آنکھ میچ کر چھبیل کو مسکراتے ہوئے بتایا، اچھا چانس ہے۔

لالہ چھبیل داس بے چارہ سٹپٹا سا گیا۔ ''میں اسے اپنی بیٹی بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے! بیٹی بنانا یا بیٹا، شادی بنانے کے بادکو چھ نہ کو چھ آپ ہی بن جائیں گا۔''

لالہ چھبیل داس نے اُس سے سر پھوڑنا مناسب نہ سمجھا اور باؤلی دادی کو

سرکاری حراست سے اپنی نگرانی میں لے لیا۔

لالہ چھبیل داس کو اُس کی مجرمانہ سیاسی دلچسپیوں کے باعث چھ سال کی سزا دی گئی تھی۔ مگر اُس کے مثالی رویے کے مدنظر اُس کی سزا کو نصف سے بھی کم کر دیا گیا تھا۔ لالہ کو دراصل سیاست کے مقابلے میں خالص سماجی کام سے زیادہ نسبت تھی اور آزاد ہونے پر اُسے کالے پانی میں اپنے کام کی گنجائش زیادہ اور بہتر لگنے لگی تھی، چنانچہ اُس نے اپنی بیوی کو لکھ بھیجا کہ مین لینڈ میں سب کچھ سمیٹ سمٹا کر وہ بھی یہیں چلی آئے۔ بے اولاد میاں بیوی تھے۔ بگلی دادی کو پاکر وہ دونوں خوشی سے پاگل ہو گئے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو نیک انسان خدا کے بندوں کو اتنے پیارے ہوتے ہیں وہ جلد ہی خدا کو بھی پیارے ہو جاتے ہیں۔ لالہ چھبیل داس اور اُس کی بیوی شانتی دیوی کئی سال پہلے باری باری خدا کو پیارے ہو گئے۔ لالہ چھبیل داس مقامی ہندوستانیوں میں نہایت مقبول تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے سے پہلے جب جاپانیوں نے پورٹ بلیئر پر قبضہ کر لیا تو ہندوستانیوں کی ایک کثیر تعداد اپنے تعلق سے اُن کے شک وشبہ کی بنا پر اُن سے نالاں ہونے لگی تھی اپنے مخبروں کی جھوٹی سچی رپورٹیں ملنے پر جاپانی ہندوستانی لیڈروں کو چن چن کر ختم کر رہے تھے۔ انہی ہنگاموں میں انہوں نے لالہ چھبیل داس کو بھی انگریزوں کی مخبری کرنے کے الزام میں سینکڑوں دوسرے لوگوں کے ساتھ سمندر میں پھنکوا دیا۔ اُس کی موت کے بعد شانتی دیوی بھی اچانک کسی انجانی بیماری کی زد میں آکر چند ہی روز میں اپنے شوہر سے جا ملی۔

لالہ چھبیل داس نے ایک نوجوان رام کشور کو بھی اپنے یہاں پناہ دے رکھی تھی۔ ملک کی آزادی سے چند سال پہلے اپنے شہر میں کوئی کام وام نہ ملنے پر رام کشور خود ہی اپنے آپ کو کالے پانی کی سزا دے کر یہاں آ پہنچا تھا۔ دو چار سال وہ لالہ چھبیل داس کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا رہا اور اُس کی موت کے بعد سرکاری نوکری مل جانے پر اُس نے اپنی بیوی رکمنی اور ننھے ٹیٹو کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

لالہ چھبیل داس کو گزرے آج ایک یگ بیت چکا ہے، لیکن اس قدر سخی

آدمی حاجتمندوں کے دل و دماغ میں سدا زندہ رہتا ہے۔ دیہاتوں میں بہتوں کو معلوم ہی نہیں کہ اُسے وفات پائے دہے لد چکے ہیں اور کوئی ضرورت لاحق ہونے پر بعض لوگ آج بھی اُس کا پتہ پوچھ پوچھ کر اُس کے گھر آ پہنچتے ہیں۔

لالہ چھبیل داس کا گھر یہی ہے؟

لالہ چھبیل داس زندگی بھر ہر سوالی کو یہی ذہن نشیں کراتا رہا کہ گھر اوپر والے کا ہوتا ہے۔

واپسی پر سوالی آپ ہی مسکرائے جا رہا ہوتا، مانو اوپر والے نے اُس کی سن لی ہو، اور اِسی مانند مسکراتے ہوئے اپنے گھر پہنچ کر پورے پانچ سو روپئے بیوی کی جھولی میں ڈال دیتا، لو، خواہ مخواہ گھبرا جاتی ہو۔ میں نے کہا تھا، لالہ جی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گے۔

کئی سمجھدار لوگوں کو تاک لگی رہتی کہ لالہ چھبیل داس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے، لیکن جو نا سمجھ تھے وہ بڑے وثوق سے سمجھانے لگتے کہ جو بانٹ بانٹ کر اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے وہ کتنے مالدار ہوتے ہیں——بابا لالو بھی اپنے ساتھ بیتا ہوا ایک واقعہ سنایا کرتا ہے۔ اللہ، لالہ کو جوار رحمت میں جگہ دے، اُس کے ایسے ہی چند نیک بندوں کی بدولت ہم ابھی تک قیامت سے بچے ہوئے ہیں۔ جاپانی سپاہیوں نے ایک غریب معصوم کو ناحق پیٹ پیٹ کر ادھ موا کر دیا۔ پہلے تو لالہ اُس کی مرہم پٹی کروا کر اُسے گھر چھوڑ آیا، مگر پھر اُسے سوچ آئی کہ غریب کی مرہم پٹی تو ہولی پر جب تک ٹھیک نہیں ہوگا کام کاج کیسے کرے گا اور کمائے کھائے گا کیا؟- ذرا سوچو بھائیو، ہمارے شہر میں اناج کے گودام تو بھرے رہتے ہیں، پھر بھی غریب بھوکوں مرتے ہیں، کیوں؟

بابا کو پٹری سے اترتے پا کر کوئی اُسے یاد دلاتا ہے کہ پہلے ایک غریب کا قصہ تو پورا کر لے۔

"ہاں، تو لالہ نے مجھ ہی سے اُس غریب کے لئے سو روپے ادھار

مانگے، یہ کہہ کر کہ وہ آج ہی مجھے پوری سو دعائیں لوٹا دے گا —— ارے بھئی، کیا خوب آدمی تھا! اُس کی بیوی نے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کے اتنا بڑا مکان تیار کرایا تھا۔ میرے سامنے ایک دن وہ اُس سے کہہ رہا تھا، ہم اکیلوں کو اِتنی جگہ گھیرے رکھنے کا کیا حق حاصل ہے؟ کسی گھربار والے کو بھی رکھ لو بھلے لوگ۔ ہمارے لئے تو اُس کے دل میں بھی تھوڑی سی جگہ بہت کافی ہے۔''

لالہ کے گھر کو کہنے کو باؤلی دادی کا گھر کہا جاتا ہے، مگر دادی بھی یہاں کہاں رہتی ہے۔ یہاں تو ایک رام کشور ہے اور ایک اُس کی بیوی شانتی دیوی، اور ایک اُن کا ٹیٹو، جوان سارے سالوں میں اتنا بڑا نکل آیا ہے اب ایم، اے پرائیویٹ کی تیاری کر رہا ہے —— دادی؟ —— دادی تو اس عمر میں بھی بدستور اپنی ماں کے ساتھ الہ آباد میں مقیم ہے۔ رام کشور ابھی تک اپنی ملازمت سے ریٹائر نہیں ہوا اور سارے دن اپنے دفتر میں ہوتا ہے۔ شانتی دیوی بھی لڑکیوں کے ایک اسکول میں بے معاوضہ پڑھا رہی ہے اور ٹیٹو صبح سے شام تک اپنے کالج کی لائبریری میں بیٹھا رہتا ہے۔ گھر خالی پڑا ہوتا ہے اور بعض اوقات اب بھی جب کوئی سورگیہ لالہ کی تلاش میں آنکلتا ہے تو باہر سے ہی کوئی اُسے بتا دیتا ہے کہ گھر والے باہر گئے ہوئے ہیں۔

ہاں بوڑھی دادی گھر ہی میں ہوتی ہے اور اِس عمر میں بھی بڑی سرگرمی سے گھر کا کام کاج نمٹا رہی ہوتی ہے، یا شاید کام نمٹا کر آنگن میں ذرا دھوپ سینکنے چلی آتی ہے، یا پھر شاید ذرا استانے کے لئے اپنے کمرے میں جا لیٹتی ہے —— نہیں، یہاں کہاں؟ —— یہیں سامنے کے سارے کام جوں کے توں کرتے ہوئے الہ آباد کے محلہ گنگا پور کے مکان نمبر دو سو چار بٹہ دو میں!

آئی —— ی! —— چارپائی پر لیٹے لیٹے بڑھیا اچانک ماں کی آواز سن کر اچھل کر پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے اور کوری کنواری دروازے کی طرف دوڑتی ہے اور کنڈی کھول کر شانتی دیوی کو مخاطب کر کے کہتی ہے، اتنی دیر سے کیوں آئی ہو ماں؟ میری کتابیں لائی ہو؟ —— اور شانتی دیوی —— نہیں، اُس کی ماں ہی

ذرا سا جھلا کر اُسے جواب دیتی ہے، پیر تو اندر رکھ لینے دو۔

گوراں چاچی بابا لالو سے کہا کرتی ہے، دادی اگر یہاں شادی کر لیتی تو الہ آباد سے یہاں آ پہنچتی۔

مگر بابا لالو اُسے جواب دیتا ہے، الہ آباد سے یہاں پہنچتی تو شادی کرتی۔

بابا لالو کے دائیں طرف کے بلیا کے ڈاکے والے کو مرے تو ایک چوتھائی صدی سے بھی اوپر ہو لیا ہے۔ ایک زمانے میں بلیا کے سارے علاقے میں اُس نے سبھی کا ناک میں دم کر رکھا تھا، مگر یہاں سزا سے چھٹی پاتے ہی وہ اتنا دھرم کرم کا منش بن چکا تھا اور کچھ اِس طرح ہاتھ باندھ کر بات کرنے کا عادی بن چکا تھا گویا ہر کوئی ساکشات بھگوان رام ہو۔ اُس کی بیوی پانی پت سے سزا پر یہاں بھیجی گئی تھی۔ ہر جان پہچان والے سے جھگڑا کئے بغیر وہ اس سے اپنائیت محسوس نہ کر پاتی، اور تو اور، اپنے مرد سے بھی جھگڑ جھگڑ کر وہ اُس سے پیار کرتی تھی۔ گوراں چاچی کو اپنے ڈاکے والے کے بارے میں بتایا کرتی تھی، میرا مرد تو کوئی مداری ہے بہن، کیا تم نے کسی کو ہاتھ باندھ کر دن رات محنت کرتے دیکھا ہے؟

اُن دونوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں کبھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اُن کا بیٹا، ڈاکٹر کرشن چندر اِس وقت پورٹ بلیئر کا ایک جانا مانا ڈاکٹر ہے۔ بعض نئے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی نہایت اعلیٰ فیملی کا فرد ہے، اور کہیں باہر سے رضا کارانہ طور پر نقل کر کے یہاں آباد ہو گیا ہے۔ مگر وہ سبھی کو بے جھجک بتا دیتا ہے، میرا باپ ایک ڈاکو تھا اور ماں خونی۔ پتہ نہیں بے چارے کیا کیا کر کے میری سبھی ضرورتیں پوری کرتے رہے۔ ڈاکٹر کرشن چندر کی ماں بیٹے کے ڈاکٹر بننے سے پہلے ہی ٹی۔ بی سے وفات پا گئی۔ ڈاکٹر چندر ٹی۔ بی کا ہی سپیشلسٹ ہے اور یہ سوچ کر آج بھی اُس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں کہ اُس کی ماں کے مرض کی تشخیص نہ ہو پائی۔

قصے والی گلی کے موجودہ مکین عام طور پر کھاتے پیتے لوگ ہیں اور جن

کا ہاتھ تنگ ہے گلی والے ان کی کچھ ایسے گپت مدد کرتے ہیں گویا وہ اپنی ہی پونجی کو کام میں لا رہے ہوں۔ اولین مکینوں میں بیشتر یکے بعد دیگرے اٹھ گئے اور جو باقی بچے ہیں ان کا بھی اب بابا لالو کے مانند چل چلاؤ ہے۔ قصوں والی گلی نے اب دوسری اور تیسری نسل کے قصے بُننا شروع کر دیا ہے، جن کے بیشتر افراد بدستور یہیں رہ رہے ہیں۔ اس ساری گلی میں صرف ایک مکان کے نئے لوگ کچھ مدت پہلے دلی منتقل ہو گئے تھے۔ وہ بھی باری باری سال میں ایک دفعہ چھٹی گزارنے یہاں اپنے پرانے گھر آتے ہیں اور جب کوئی بھی یہاں نہیں ہوتا تو اُن کا خالی گھر اُن کے پرکھوں سے بدستور آباد ہوتا ہے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''۔ مولوی منظور احمد نے اس بات پر بابا لالو کو ٹوکا ہے۔

''پَر میں درباری لعل مرحوم کو اپنی آنکھوں سے اپنے مکان سے برآمد ہوتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔''

درباری لعل کا بڑا لڑکا کستوری لعل بڑا ملنسار ہے۔ وہ جب بھی دلی سے گھر آتا ہے تو محلے کے بچے کھچے بڑے بوڑھوں کے ساتھ کافی وقت گزارتا ہے۔

''تم تو دلّی کے ہی ہو کے رہ گئے ہو کستوری۔''

''نہیں، بابا، ہر سال مہینے پچیس دن کے لئے آ پہنچتا ہوں۔''

''نہیں، بیٹا، اب ہمیشہ کے لئے یہیں آ جاؤ۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو، بابا۔'' کستوری لعل گوراں چاچی کے ہاتھ کا گرم گرم سموسہ کھاتے ہوئے بھی بولتا چلا جاتا ہے۔ دلّی میں رہتے تو سبھی ہیں، پَر وہاں بستا کوئی نہیں، مگر کیا کیا جائے، رہنا تو وہیں پڑتا ہے جہاں دھندا ہو۔''

سموسے سے خالی ہو جانے پر اُس کے منہ میں دلّی بھر آتی ہے۔ ''کام دھندے کے لئے دلّی بڑھیا ہے، مگر وہاں کسی کو کسی سے ملنے کی فرصت نہیں۔''

''تم بہن بھائی تو وہاں اکٹھا ہی رہتے ہو گے؟'' گوراں چاچی اُس کی پلیٹ میں ایک اور سموسہ رکھ کر پوچھتی ہے۔

''نہیں، چاچی، دلّی میں بڑے گھروں کا رواج نہیں، سب اپنے اپنے پنجروں میں بند ایک دوسرے سے میلوں دور رہتے ہیں اور صرف ٹیلیفون پر مل کر ایک دوسرے کی شکلیں بھی بھول جاتے ہیں——''

''ارے!'' چاچی ہنسنے لگتی ہے۔ ''کتنی عجیب بات ہے!۔''

اِس سے بھی عجیب بات یہ ہے چاچی، کہ دلی کی بھیڑ میں اگر کوئی چوکس ہو کر نہ چل رہا ہو تو کوئی غنڈہ اُس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور اِس دوران اگر اِس کام سے بھی بڑے کام کی صورت نکل آئے تو وہ اُس راہگیر کو بیچ کر، اپنے پیسے وصول کر کے اُسے کسی اور غنڈے کے حوالے کر دیتا ہے——''

''ارے! ہم تو بال بال بچ گئے بابا۔'' چاچی لالو کو مخاطب کر کے کہتی ہے۔ ''جو علی کا وکیلی کا داخلہ ممبئی میں نہیں کرایا——''

''ممبئی دلی سے بھی گیا گزرا ہے چاچی۔ ہمارے پورٹ بلیئر کا مقابلہ اُدھر کا کوئی شہر نہیں سکتا۔''

''تو پھر بیٹا، اپنی چاچی کا کہنا مانو اور بیوی بچوں کے ساتھ گھر لوٹ آؤ۔ میں تمہیں ہر روز تازہ بہ تازہ سموسے کھلایا کروں گی۔ لو، ایک اور لو۔''

کستوری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہے اور پلیٹ سے ہاتھ بڑھا لیتا ہے۔ ''بس، چاچی بہت ہو گیا۔''

''بہت کیسے؟ دلّی میں ہوا کھاتے ہو کیا؟''

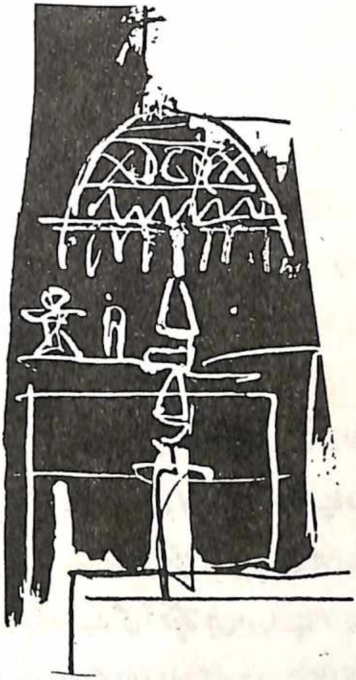
''وہاں کی ہوا بھی بڑی گندی ہے چاچی۔''

(۲)

پورٹ بلیئر میں آریہ سماج مندر صرف اِس حد تک مندر ہے کہ ہراتوار کی صبح کو کسی نہ کسی دھرم کا کوئی مقامی نیتا اپنے دھرم پر بھاشن کرنے کے لئے آجاتا ہے جسے سننے کے لئے کچھ لوگ جمع ہو ہی جاتے ہیں۔ جن بوڑھوں کو سنائی دینا بند ہو چکا ہے وہ تو سو کام چھوڑ کے بھی آ پہنچتے ہیں اور اپنے عزیزوں کو یہ کہہ کر ساتھ لے آتے ہیں کہ چھ دن تو اُلٹے سیدھے دھندوں میں بِتا دیتے ہو، چلو ایک خالی دن تو اپنے پیدا کرنے والے کی باتیں سن لیا کرو۔

''پیدا کرنے والے کی باتیں تو چھیوں دن سنتے رہتے ہیں''۔ کچھ ایسا ہی جواب سن کر وہ انہیں سختی سے اپنے آگے آگے ہانک لیتے ہیں۔

آریہ سماج کے کھیل کے دونوں میدان ہر روز شام کو بچوں اور نوجوانوں سے بھرے رہتے ہیں اور لنچ سے پہلے بعض بوڑھے گپ شپ کے لئے سماج کے ہال میں آ جمع ہوتے ہیں اور مزے لے لے کر پرانے وقتوں کو دہراتے ہیں، یا اپنے تجربات کو بیان کر کر کے ایک دوسرے کی بیماریوں کا علاج تجویز کرتے ہیں۔ سہ پہر کو سماج میں کچھ ایسا سناٹا چھایا رہتا ہے گویا پورٹ بلیئر کا سمندر اپنے کنارے سے اِسی جانب بڑھ آیا





ہو اور آریہ سماج اپنے سانسوں اور صداؤں کو روک کر اُسی میں ڈوبا پڑا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سہ پہر کے وقت جب کسی بوڑھے کو چارپائی پر کروٹیں بدلتے ہوئے چین نہیں آتا اور وہ اِدھر ہی آنکلتا ہے تو باہر باہر سے ہی گھوم پھر کر لوٹ جاتا ہے۔

بابا لالو آج آٹھ ساڑھے آٹھ بجے صبح ہی آریہ سماج مندر جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا ہے۔ مولوی منظور احمد نے اُسے پیغام بھیجا تھا کہ ایک ضروری کام ہے، وہ بھی نو ساڑھے نو کے قریب وہاں پہنچ جائے گا۔ بابا کو جہاں کہیں پہنچنا ہوتا ہے، راستے میں رک رک کر وہاں پہنچتا ہے۔ اُسے اپنی قصوں والی گلی کے آخری ٹوٹے پھوٹے مکان کے دروازے پر اُس سے بھی ٹوٹا پھوٹا شبو چور بیٹھا مل گیا ہے۔

''السلام علیکم، شہاب الدین''۔

شبو چور مڑ کر دیکھتا ہے، جیسے بابا لالو جسے بلا رہا ہے وہ اُس کے پیچھے کھڑا ہے۔

''میں تم سے مخاطب ہوں شبو چور۔ پیچھے مڑ مڑ کر کسے دیکھ رہے ہو؟''

''یوں کہو نا، میں سوچ رہا تھا، یہ شہاب الدین کون ہے۔''

شبو چور پاگل تو نہیں، مگر اُس کا دماغ دبا دبا سا ہے۔ وہ بڑی کوشش کرتا ہے کہ ذہنی طور پر چُست دِکھے، مگر جتنی کوشش کرتا ہے اتنا ہی اُس کا دماغ اپنی جگہ سے سرک جاتا ہے۔ مولوی منظور احمد اُسے نصیحت کرتا رہتا ہے، تمہیں کوئی اور کام تو ہے نہیں شبو چور، سکون کے لئے پانچوں وقت نماز پڑھا کرو۔

بابا لالو شبو چور کے پہلو میں آبیٹھتا ہے۔ ''گھر کی چوکیداری کر رہے ہو؟''

''چوکیداری کیا کروں گا بابا؟ تم لوگوں نے چور کہہ کہہ کر مجھے سچ مچ کا چور بنا دیا ہے۔''

''دیکھو نا، اپنے ہی گھر کو چرا کر چٹ کر گیا ہوں۔''

کالے پانی آنے سے پہلے شبو چور پٹھان کوٹ میں رہتا تھا۔ میٹرک

پاس کر لینے کے بعد اُسے کوئی نوکری نہ ملی تو وہ چوروں کے کسی گروہ سے جا ملا اور تین چار بار سزا پانے کے بعد بھی نہ سدھرا تو کسی بینک میں کوئی بڑا ہاتھ مارنے اُسے یہاں بھیج دیا گیا۔ اُس کے آگے پیچھے تو کوئی تھا نہیں، چنانچہ سزا پوری ہو جانے پر اُس نے یہیں بس جانے کو ترجیح دی۔ وہ شبو چور کے نام سے اِس لئے مشہور ہو گیا کہ جیل میں خونیوں اور ڈاکوؤں کو وہ معلوم تو چور سا ہی ہوتا ہے مگر اُنہیں یقین نہ آتا تھا کہ وہ صرف چوری کی سزا میں یہاں بھیجا گیا ہے۔

''کُھل کے بتاؤ شبو چور، تم نے آخر کیا کیا تھا؟''

''کرنا کیا تھا؟ مجھ پر تو چوری کا الزام بھی خواہ مخواہ تھوپا گیا۔''

''خواہ مخواہ؟ ——— ارے بھئی، تم تو واقعی محض چور ہو۔''

بابا لالو کو مسکین صورت شبو چور پر ترس آنے لگا ہے۔ وہ شبو چور کی پوری زندگی سے واقف ہے۔ یہاں بس جانے کے بعد جب شبو چور سے اُس پندرہ بیس سال بڑی رحمتاں نے پوچھا، کیا تمہیں تم سے چرا لوں، چورا؟ ——— تو وہ جھٹ ہی راضی ہو گیا۔ تم ہی سہی، اور تو کوئی میرے مال و متاع کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔

رحمتاں اور شبو چور نے شادی تو کر لی مگر اپنے پہلے ہی بچے کی پیدائش پر رحمتاں اُسے چھوڑ کر چلتی بنی۔ شبو چور نے اپنے بیٹے رضا کو بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا، پر لونڈا ابھی قد نکالتے ہی کسی انگریز ٹورسٹ کے ساتھ ایک بار جو ولایت جا پہنچا تو اب تک اُس نے یہاں اپنا منہ نہیں دکھایا، ہاں، یہ ضرور ہے کہ پہلے ہر مہینہ باقاعدگی سے اپنے باپ کو دس پاؤنڈ بھیجا کرتا تھا اور اب چند سال سے بیس پاؤنڈ بھیج رہا ہے، جس کا ایک تہائی اپنے آپ سے چرا کر شبو چور اپنے بیٹے کو گالیاں بکتے ہوئے مولوی منظور احمد کو دے آتا ہے تاکہ وہ اسے یتیموں میں بانٹ دیا کرے۔

بابا لالو شبو چور کی گیلی گیلی آنکھیں دیکھ کر ترحم سے اُس کے کندھے کو دباتا ہے۔ ''مولوی منظور احمد تمہارے بیٹے کی تعریف کر رہا تھا۔''

''اُس حرامی پلے کا نام مت لو بابا۔''

''اِتنی دور سے تمہیں ہر مہینے پیسے بھیجتا ہے اُسے برا بھلا کیوں کہتے ہو؟''

''پھوٹی کوڑی بھی نہ بھیجتا بابا، پَر ایک بار تو آ کر مجھے سنبھال لیتا۔''

''وہیں بیٹھ کے جو سنبھال رہا ہے''۔

شبو چور کی آنکھوں میں پانی بھر آیا ہے۔

''اُسے شرم آتی ہے بابا، کہ میرے ساتھ رہے گا تو لوگ اُسے چور کا بیٹا کہیں گے۔'' اُس نے آنکھوں کا پانی آستین سے پونچھا ہے۔ ''وہ تو مجھے چوری میں بے مطلب پھانس لیا گیا بابا، تم ہی بتاؤ بنک میں ڈاکہ ڈالا جاتا ہے، یا چوری کی جاتی ہے؟''

بابا لالو اُس پر ترس کھاتے ہوئے بھی اپنی مسکراہٹ کو نہیں روک سکا ہے۔ ''اگر ڈاکہ ڈالتے اور ڈاکے میں قتل وتل کے کیس میں بھی پھنس جاتے تو پھانسی یا عمر قید کی سزا ملتی۔''

''نہیں، میں نے ڈاکہ ڈالا، نہ چوری کی''

شبو چور نے ہر کسی کو یہی باور کرانے میں عمر گزار دی تھی کہ میں صرف نام کا شبو چور ہوں۔

''میری کہانی ایک دفعہ دھیان سے سُن لو بابا، تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کیسے پھنس گیا —— لو، سنو، میں ——''

بابا ہنستے ہوئے کھڑا ہو گیا ہے۔ ''تمہاری کہانی میں کئی بار سن چکا ہوں —— ''مگر اُسے خیال آیا ہے کہ مجھے بھی لوگ اکثر یہی کہتے ہیں۔ تمہاری یہ کہانی ہم سینکڑوں دفعہ سن چکے ہیں، کوئی نئی کہانی سناؤ —— بابا نے اپنے آپ سے پوچھا ہے۔ کیا وہی کہانی ہر نئی بار کوئی نیا مطلب ادا نہیں کرتی؟ وہ پھر بیٹھ گیا ہے۔ ''میں تو تمہیں صرف اِس لئے شبو چور کہہ کے بلاتا ہوں کہ مجھے یقین ہے۔ تم چور نہیں۔'' بابا نے شبو چور کی پیٹھ تھپکی ہے۔ ''تم تو صرف دل چراتے ہو''۔

''تو پھر میری پوری کہانی سن کے جاؤ''۔

''نہیں، شبو چور، آج مجھے آریہ سماج میں مولوی منظور سے ملنا ہے۔ دیر

ہو جائے گی۔''

''مولوی منظور سے کہنا بابا، میں کل پرسوں آؤں گا۔ اِس ماہ یتیموں کی امانت میرے پاس پڑی رہ گئی ہے۔''

''لاؤ، میں اُسے دے دوں گا۔''

''نہیں، میں خود آپ ہی جاؤں گا۔ چلا جاتا ہوں تو اُس کے منہ سے عربی شریف بھی سن لیتا ہوں۔''

بابا لالو کو یاد آیا ہے کہ راستے میں چمنی پہلوان سے بھی ملنا ہے اور وہ اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ چمنی پہلوان اور اُس کے بیٹے میں آئے دن کوئی جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے، اور دونوں کو عادت سی پڑ گئی ہے کہ لالو بابا آ کر اُن کا جھگڑا انمٹائے۔

''یہ لو بابا، تمہاری داہنی جیب سے یہ چلّر کیسے میرے ہاتھ میں چلا آیا ہے؟''

''او شبو چور! شبو چور! ——'' بابا نے قہقہہ لگایا ہے۔ ''تم اپنے کام سے باز نہیں آؤ گے۔''

''نہیں، بابا، یہی بتانے کے لئے تو دے رہا ہوں کہ میں چور نہیں ہوں۔''

''نہیں، یہ پیسے میں نے تمہارے لئے ہی رکھ چھوڑے تھے، تا کہ ہاتھ ڈالو تو تمہیں خالی جیب نہ ملے۔''

بابا نے اُسے کھڑا ہونے کو کہا ہے اور نہ جانے کیا سوچ کر اُسے گلے لگالیا ہے اور پھر وہاں سے آگے بڑھنے سے پہلے اُس سے کہا ہے۔ ''جاؤ، اندر جا کر آرام کرو۔''

''نہیں، بابا، میں ہمیشہ ڈاکے والے کے ڈاکٹر بیٹے کا انتظار کر کے اندر جاتا ہوں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے وہ ہر روز میری صحت کا حال پوچھتا ہے اور نبض دیکھ کر —— ضرورت ہو —— تو دوائی بھی دے جاتا ہے۔'' اُس نے ڈاکے والے

کے گھر کی جانب نظر دوڑائی ہے۔ کیا پتہ، بابا، شبو چور بھی کوئی ڈاکے والا ہوتا تو اللہ اُس کی جھولی میں بھی کوئی ایسا ہی ڈاکٹر بیٹا ڈال دیتا——''

''جو کچھ اُس نے ڈالا ہے، اُسے تو سنبھالو''

قصے والی گلی سے نکل کر سیدھا پتلے والے چوک میں آپہنچا ہے جہاں اُسے چمنی پہلوان کے بارہ چودہ سالہ پوتے نندو نے روک لیا ہے۔ ''میں تمہارے پاس ہی جا رہا تھا، بابا''۔

''ارے، میں بھی تو تمہارے ہی یہاں جا رہا ہوں۔ آؤ۔''

''نہیں، بابا، تم جاؤ، مجھے کبڈی کھیلنے جانا ہے۔'' کبڈی کے شوق میں ہی وہ پچھلے سال فیل ہو گیا تھا۔

''اسکول جانا پھر بند کر دیا ہے؟''

''نہیں، بابا، آج چھٹی ہے۔''

''چھٹی کاہے کی ہے؟''

''اتنا بھی معلوم نہیں؟ آج گاندھی جینتی ہے۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے بیٹا'' بابا نے نندو سے پوچھ لیا ہے۔ ''گاندھی جینتی کیا ہوتی ہے؟''

''اِتنا بھی نہیں جانتے، بابا'' نندو ہنسنے لگا ہے۔ ''کہ گاندھی جینتی کیا ہے۔ پھر کبھی سب کچھ بتاؤں گا۔ اِس وقت مجھے کبڈی سے دیر ہو رہی ہے۔'' اُس نے بابا سے منہ موڑتے ہوئے اضافہ کیا ہے۔ ''دادا نے کہا ہے، جلدی سے ہمارے گھر پہنچو۔''

نندو کو سڑک پر بھی کبڈی کھیلنے کے انداز میں چلتے پا کر وہ مسکرا دیا ہے اور مسکراتے ہوئے جب اُسے یاد نہیں رہا ہے کہ وہ کیوں مسکرا رہا ہے تو اُس کا دھیان گاندھی کی طرف چلا گیا ہے۔ اُسے یاد ہے کہ جب اُسے گاندھی کے قتل کی خبر ملی تھی تو اُس دن وہ جالم سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے اُس کے کسی بیان پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا مگر اچانک یہ خبر سن کر اُس کے دل میں ایک غبار سا اٹھا تھا اور ایک گھگی سی بھر کر اُس نے اپنی

ہنسی تھمنے سے پہلے ہی بے اختیار رونا شروع کر دیا تھا اور جالم اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے، یا رو رہا ہے؟

''نہیں، جالم سنگھ، کچھ نہیں، بس یونہی ذرا——''

جن بڑے لوگوں کے ایثار و عظمت کے قصے سن سن کر اور اکثر اُن کی باتیں کر کر کے بھی ہم اُنہیں بھولے سے ہوتے ہیں وہ اپنی موت پر ہمارے دل و دماغ میں کیوں کر یکلخت جی اٹھتے ہیں۔ جالم سنگھ اپنی پگڑی میں ہاتھ ڈال کر سر کھجانے لگا تھا۔ بابا لالو جیسا سوچ سوچ کر ہنسنے اور رونے والا آدمی بھی اِس طرح پاگل سا دِکھنے لگے تو بات کیسے سمجھ میں آئے؟۔اُس نے سوچا کہ واہگورو سے ہی پوچھوں گا کہ یہ قصہ کیا ہے۔

اور جب واہگورو نے اُسے بتایا کہ کیا قصہ ہے تو اپنی تسلی ہو جانے پر اُس نے لالو بابا کو بھی سمجھانے کی کوشش کی——پھکر مت کرو بابا، تمارے کو کچھ بھی نئیں ہوا ہوایا۔ واہگورو کہتا ہے، گاندھی کچھ چیج ہی ایسی اے۔ چھوٹے سائیں تو روج روج جنم لیتے ہیں پر سارے سنسار کا سائیں مر جائے تو سوجھ بوجھ کا کیا کام؟

گاندھی کی سچائی اور سادگی اور سَرلتا کے بارے میں سوچ کر لالو بابا کا دل پیار اور عقیدت سے بھر آیا ہے، مگر اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ گاندھی نے بات بات میں ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی کے بھائی بھائی ہونے پر اِتنا زور کیوں دیا۔ جو ہوں ہی بھائی بھائی، اُنہیں کیا ایک دوسرے کو ہمہ وقت بھائی بھائی کہے بغیر اپنا رشتہ یاد نہیں رہے گا؟ وہ جی ہی جی یہ دیکھ کر ہنس رہا ہے کہ ہمارا علی اپنی بامنی ماں کو یقین دلا رہا ہے، ماں، ہم بھائی بھائی ہیں۔!

''اوئے یہ بات نہیں، بابا۔'' وہ گویا جالم سنگھ سے ہمکلام ہے۔ ''تمہارے ابو کو اِلم نئیں، اودھر ہندو مسلم اسائی کس تراں اِک دوجے کا گلا کاٹنے سے بھی ہتھ نہیں روکتے۔ میں تو اکھبار نہیں پڑھتا، بابا، پر اپنے دُربھ سنگھ دا پُتر مجھے بتا ریا تھا، اودھر اب بھی سر پھ اِس دجا سے پھساد کھڑے ہو جاتے ہیں کے واہگورو کا نام اللہ ہے یا ایشور۔ بھلا جے کوئی بات اے؟——''

لالو بابا اپنے دھیان میں چلا جا رہا ہے۔ راستے میں گورکھ داس نے اُسے اپنے صابن کی دکان سے بڑی چکنی آواز میں پکارا ہے۔ آج دکان پر نہیں بیٹھو گے بابا۔ اور کوئی جواب نہ پا کر سر ہلا کے پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا ہے۔

''تم اپنے واہگورو کا پاٹھ پڑھتے رہو جالم۔ مجھے یہ بتاؤ، اگر اُسے کبھی اللہ کہہ کے بلاؤ، تو وہ تم سے ناراض ہو جائے گا؟''

''میری چھوڑو للوا، میں تو اُسے پھادر ڈینیل بھکش کی نکل میں اپنا ہی کوئی گلت سلت انگریجی نام دے کر بھی آواج دیتا ہوں، تو وہ اپنے سارے کام چھوڑ کے چلا آتا ہے، ''بولو، اب کیا آن پڑی ہے؟''۔

بابا لالو جس چوک میں سے گزر رہا ہے وہاں سے گاندھی کے پُتلے نے بھی اُسے آواز دی ہے، مگر وہ اپنے خیالات کی رو میں بہے جا رہا ہے، جس پر گاندھی نے لاٹھی تھامے پھر سے کھڑے کھڑے اپنی راہ چلنا شروع کر دیا ہے۔ ہمارا نیا پنڈت تلسی دھر بڑا ودوان پُرش ہے، لیکن اگر میں کبھی اُس کی کتھا سننے جا بیٹھتا ہوں تو اُسے چھینکیں کیوں آنے لگتی ہیں؟ —— اِس لیے تو نہیں، کہ میں مسلمان ہوں؟

''تم اِسے نہیں جانتے للوا —— ہمارا وہ پرانا پنڈت کوئی اور ہی چیج تھا، میں نے تو اُس کی موت پر بھی کہا تھا کے اِدھر سے ہی کسی چھوٹے موٹے بامن کو پنڈت بنا دو، مگر گردھر سیٹھ اَڑ گیا تھا کہ مین لینڈ کے کسی بُدھی وان کو بلایا جائے——''

''مگر پنڈت تلسی دھر بدھی وان تو بہت ہے''۔

''اوئے للوا، وہ بدھی کس کام کی، جو بندوں کو بانٹ دے۔''

بابا لالو نے سر اُٹھا کر دیکھا ہے کہ وہ چمنی پہلوان کے مکان کو پیچھے چھوڑ کر آریہ سماج سے بھی آگے نکل آیا ہے اور جالم سنگھ کے لکڑی کے گوردوارے کے دروازے آ کھڑا ہوا ہے۔

''اوئے، بھرے دن پورا چاند کیسے چڑھ آیا اے؟''

''مجھے پتہ ہی نہیں چلا، جالم سنگھ، کہ آریہ سماج پیچھے رہ گیا ہے۔ بوڑھا

ہو گیا ہوں نا۔''

''میں تم سے پنج دس سال ہی تو چھوٹا ہوں بابا، میں بڈھا ئیں ہو یا تو تم کیسے ہو گئے؟'' جالم سنگھ نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ہے۔ ''جب واہگورو بلاتا ہے تو سب کچھ پیچھے چُھٹ جاتا اے ــــ آؤ! ــــ''

''نہیں، جالما، مجھے بہت دیر ہو گئی ہے، سماج میں مولوی منظور میرا انتظار کر رہا ہوگا۔''

''واہگورو سے تو مل کے جاؤ''۔

''اُس سے وہیں مل لوں گا۔''

جالم ہنسنے لگا ہے، ''ہاں، اے بھی ٹھیک اے، وہ کہاں نئیں؟۔''

(۳)

مولوی منظور احمد نے بابا لالو کو آریہ سماج کے ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور اپنی سیٹ سے ہی چلا آیا ہے۔ ''اِتنی دیر، بابا! پورے ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔''

''تو کیا ہوا، مولوی منظور؟ میں نے ساری زندگی انتظار کیا تو تم کہیں جا کے کالے پانی پہنچے۔''

دونوں ہنسنے لگے ہیں۔

لالو بابا کرسی کھینچ کر مولوی منظور احمد کے سامنے بیٹھ گیا ہے۔

''لو، یہ چنے کھاؤ۔'' مولوی منظور احمد نے اپنی جیب سے بھنے ہوئے چنوں کی مُٹھی بھر کر اُس کی طرف بڑھائی ہے۔ ''دیر کیوں ہو گئی؟''

''یار، آتے آتے میں مہاتما گاندھی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''سوچتے سوچتے اگر چلتے بھی رہے تو دیری کیوں؟——''

''نہیں، چلتے چلتے میں آریہ سماج سے آگے نکل گیا۔'' بابا نے منہ میں چنے پھانک کر کہا ہے۔ ''اور لکڑی کے گوردوارے جا پہنچا۔''

''سالے سے ملنے کے بہانے خدا کے گھر بھی جا پہنچتے ہو۔'' مولوی منظور احمد نے بھی منہ میں چنے بھر لئے ہیں۔

''ہاں، مولوی منظور، ٹھیک ہی کہتے ہو، میرا خدا مجھے اس لئے معاف کردے گا کہ میں نے ساری زندگی جالمے کی بہن سے پیار کیا ہے''۔ ''وہ تو ہے، پر سوچ کیا رہے تھے؟''

''بتایا ہے نا، مہاتما گاندھی کے بارے میں، مین لینڈ میں ہندو مسلم جھگڑے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی اگر ——''

''ارے! اِسی لئے تو میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔'' چنے حلق سے اتارنے کے بعد مولوی منظور احمد کو پانی کی طلب ہونے لگی ہے۔ ''میں پہلے اپنے لئے پانی لے آؤں۔'' وہ اٹھ کر ہال کے دروازے کی طرف بڑھا ہے۔

''ایک گلاس میرے لئے بھی لیتے آؤ۔''

اُس کے جانے کے بعد بابا لالو کو فکر لاحق ہونے لگی ہے کہ خدانخواستہ کیا یہاں بھی کہیں کوئی جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے، اور پھر وہ اپنی سوچ پر خود آپ ہی ہنس دیا ہے —— ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ —— مگر اُس نے خود کو روک کر بتایا ہے کہ جھگڑوں کی کوئی منطق تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ جب اور جیسے بھی ہو لیں، اِسی اثنا میں مولوی منظور احمد پانی کے دو گلاس لے کر آ گیا ہے۔ بابا نے اُس سے ایک گلاس لے لیا ہے۔

''جلدی بتاؤ، کیوں بلایا ہے؟''

''اپنا پنڈت تلسی دھر ہے نا، وہ اتر پردیش سے کسی ہندو لیڈر کو یہاں بلا رہا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ ہم بھی اُسے سنیں گے۔'' مگر اُس کے کان کھڑے ہو گئے ہیں۔''

''نہیں، وہ لیڈر صرف ہندوؤں سے رابطہ کرنے کے لئے آئے گا۔''

بابا لالو کا ماتھا ٹھنکا ہے مگر اُس نے اپنا سر جھٹک دیا ہے۔ ''تو بھی کیا ہوا،

مولوی منظور؟ ہم نہیں سنیں گے اور اپنی بامن بیوی کو سننے کے لئے بھیج دیں گے۔''

''میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ۔'' مولوی منظور احمد نے اپنے خالی منہ کو پھر چنوں سے بھر لیا ہے۔ ''وہ یہاں ہندوؤں کو یہ بتانے آ رہا ہے کہ مسلمان پچھلی صدیوں میں ہندوؤں پر کیا ظلم ڈھاتے رہے ہیں، اور یہ، کہ اب وقت آ گیا ہے، ہندو کمر کس لیں۔''

''اور کمر کس کر کیا کریں؟ بابا لالو اپنا غصہ دبانے کی بے سود کوشش کرنے لگا ہے۔

''اگر یہاں کا ماحول بھی مین لینڈ کی طرح بگڑ گیا بابا، تو ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہ کر پاؤ گے۔ لو، اور چنے کھاؤ۔''

بابا لالو نے اُسے اپنی مٹھی کھول کر دکھایا ہے کہ ابھی پچھلے بھی پڑے ہیں۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

''سورج بھان لوہے والے نے۔ اُس نے تو تجویز کیا ہے کہ سب لوگوں کی میٹنگ کر کے پنڈت تلسی دھر پر بریک لگا دینی چاہئے۔''

''مگر یہ کیا ضروری ہے، ایک پنڈت ہی ایسا کر رہا ہو، اور بھی بعض لوگ اُس کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں۔'' مولوی منظور احمد کے تیز تیز ہلتے دانتوں میں چنے کا کوئی سخت دانہ آ گیا ہے جس پر وہ بلبلا سا اٹھا ہے۔ ''باہر سے آ کر بسے ہوئے بعض اور لوگ بھی پنڈت کے ساتھ ہیں۔''

''مجھے پہلے ہی ڈر سا تھا کہ پنڈت تلسی دھر اپنی الٹی سیدھی پر نہ اتر آئے۔''

''ہمارا ایشر سنگھ بھی پنڈت کے ساتھ مل گیا ہے بابا۔'' بابا لالو نے ٹھنڈا سانس بھرا ہے۔ ''لالہ جھبیل داس کا زمانہ یاد ہے مولوی منظور؟ کیا رام راج تھا!۔'' وہ ذرا سوچنے کے لئے رک گیا ہے۔ ''فکر مت کرو۔ اپنے بھائی شری رام جو ہیں۔ کل نو

ساڑھے نو بجے صبح میرے پاس آؤ۔ دونوں چلیں گے۔''

اِسی دوران دو اور بوڑھے، حکیم کرشن دیو اور شیو شنکر پانی بھی اُن کے پاس آ بیٹھے ہیں اور اُنہیں اکٹھا ہوتے دیکھ کر بعض ایک اور بھی، لالو بابا اور مولوی منظور کی باتوں میں دلچسپی لینے لگے ہیں اور معاملہ ذہن نشین ہو جانے پر اُن کا ردعمل بھی یہی ہے کہ کوئی گڑبڑ پیدا ہونے سے پہلے ہی کچھ کرنا چاہئے۔''

''مگر معاملہ تو پہلے ہی بگڑ چکا ہے —— '' شوشنکر پانی نے کہا۔

شوشنکر پانی شاعر ہے اور مقامی جلسوں جلوسوں میں بڑے دھوم دھڑ کے سے اپنی نظمیں سنانے سے پہلے معصوم سے فخر سے لوگوں کو بتایا کرتا ہے کہ یہ نظمیں میں نے خود آپ لکھی ہیں۔ اُس کی بیوی مسلمان ہے اور میاں بیوی کوئی چالیس برس سے بڑے چین سے زندگی بسر کر رہے ہیں، اور لالو بابا اور گوراں چاچی کی طرح وہ بھی یہی کہا کرتے ہیں کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کو کالے پانی پھینکوا دیا گیا اور آنکھیں چار ہوتے ہی ہم نے جو ایک دوسرے کو گلے لگالیا تو ابھی تک جوں کے توں گلے لگے ہوئے ہیں۔

''جوں کے توں کیسے، پانی؟'' حکیم کرشن دیو نے اُسے ٹوک دیا ہے۔ ''گلے ملتے بوڑھی رگیں اب ٹیڑھی میڑھی ہونے لگتی ہیں تو دونوں دوائی کے لئے دوڑے آتے ہو۔''

مولوی منظور اُنہیں پھر پٹری پر لے آیا ہے۔ ''سوچنا اب یہ ہے کہ پنڈت تلسی دھر کو کس طرح روکا جائے۔''

شوشنکر پانی نے اُنہیں یاد دلایا ہے کہ ایک پنڈت ہی کیوں، باہر کے لوگ بھی تو ہیں۔''

''ہاں، ہوا ہی بگڑ جائے۔'' حکیم بولا ہے۔ ''تو بیماری کو پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟''

لالو بابا نے شاید اپنے آپ سے ہی کہا ہے۔ ''فکر مت کرو، میں

اور مولوی منظور کل صبح بھائی شری رام سے ملنے جا رہے ہیں۔''
''بھائی کا بخار نہیں اتر رہا تھا۔'' حکیم کرشن دیو نے اُنہیں اطلاع دی ہے۔ ''ڈاکٹر لانبا بھی فیل ہو چکا تھا۔ آخر میری دوا نے کام کیا ہے۔ اب صرف ذرا کمزوری باقی ہے۔''

''آپ بھی کل وہاں پہنچ جائیے۔'' لالو نے بابا حکیم کرشن دیو سے کہا ہے۔

''اکیلے ہی چنوں کا مزہ لئے جا رہے ہو مولوی منظور۔'' حکیم کرشن دیو نے اُسے منہ ہلاتے ہوئے پا کر مخاطب کیا۔ ''تھوڑے ہمیں بھی دو، بلکہ ہماری بیوی کے لئے بھی دو، اُس نے تو تمہارے چنوں کی وجہ سے ہی تمہیں بڑے مولوی کا نام دے رکھا ہے۔

''ہاں، حکیم صاحب، بڑی بہنوں کی دعائیں ہی تو بڑا مولوی بناتی ہیں۔ یہ لیجئے۔'' اپنی واسکٹ کی پہلو کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مولوی منظور احمد نے کہا ہے۔
''آپ باقی کے یہ سارے چنے کملا بہن کے لئے لے جائیں۔''

''اور اندر کی جیب کے؟''

''یار حکیم صاحب، بڑا مولوی تو آپ کو ہونا چاہیئے۔ ہر جھوٹ پکڑ لیتے ہیں۔''

''میں مولوی ہوتا اور آپ حکیم، تو آپ کے مریضوں کے جسم دُکھتے رہتے اور میرے عقیدت مندوں کی روحیں۔''

حکیم کرشن دیو نے مولوی منظور احمد کی اندرونی جیب بھی چنوں سے خالی کروالی ہے۔

آریہ سماج سے اٹھ کے لالو بابا کو اچانک یاد آیا ہے کہ ابھی تو چمنی پہلوان کے گھر جانا بھی باقی ہے، بابا تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سیدھا چمنی پہلوان کے یہاں آن پہنچا ہے۔

چمنی پہلوان بابا سے اس طرح پیش آیا ہے گویا اُس کا سارا جھگڑا اپنے بیٹے کی بجائے اُسی سے ہو۔

''میں نے تو اپنا پوتا بھی بھیجا تھا بابا، تا کہ سارے کام چھوڑ کے اُسی دم چلے آؤ۔''

''ارے بابا، آ گیا ہوں نا۔ مولوی منظور احمد نے بھی بلا بھیجا تھا۔ وہ کام بڑا ضروری تھا۔''

''چمنی پہلوان بھاڑ میں جائے، اب کیا فائدہ؟ وہ تو میری پگڑی مٹی میں ملا کر اپنے کام پر جا چکا ہے۔''

''تمہارے پگڑی ہی کہاں ہے۔'' چمنی پہلوان کی بیوی نے لقمہ دیا ہے۔ ''جو میرا بیٹا مٹی میں ملائے گا؟'' پھر اُس نے اپنا سر لالو بابا کی طرف پھیر لیا ہے۔ تمہارا یہ پہلوان خواہ مخواہ گھر میں ہر کسی سے لڑتا رہتا ہے۔''

''تم چپ رہو کورے، تم ماں بیٹے نے میری زندگی نرک بنا رکھی ہے۔''

''ہاں، ہم سب کے گلے گھونٹ دو اور اکھاڑے میں ڈھول کی تھاپ پر اکیلے ناچتے رہو، میں تو تنگ آ گئی ہوں۔''

''تنگ آ گئی ہو تو طلاق کیوں نہیں لے لیتیں؟''

''دیکھا، بابا - دیکھا؟ تمہارے پہلوان کی یہی جلی کٹی سن کر میرا جی چاہتا ہے، اپنے آپ کو آگ لگا لوں۔''

چمنی پہلوان اپنے پرانے وقتوں میں ایک حریف پہلوان کو قتل کروا دینے کے جرم میں کالے پانی آیا تھا اور اُس کی بیوی اِس لئے کہ کسی اور عورت سے جنسی تعلقات کی بنا پر اُس نے اپنے عاشق کی جان لے لی تھی، مگر یہاں کالے پانی کی سزا بھگت کر دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا تو یہ پورے پینتیس سال آپس میں لڑ لڑ کر بھرے پرے گھر کے مالک بن گئے، کچھ ایسے، کہ اُن میں جھگڑا نہ ہوتا رہے تو اُن کی محبت کا یقین ہی نہ آئے۔ چمنی پہلوان کا بیٹا بوڑھوں اور کم عمر بالغوں کے ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر

ہے، لہٰذا اپنے باپ کی ویسے ہی سرزنش کرتا رہتا ہے جیسے اسکول میں دوسرے بوڑھے شاگردوں کی، جو چمنی پہلوان کو قطعاً پسند نہیں۔

''مجھے اپنے گھر میں بھی کسی پر اِتنا بھروسہ نہیں، بابا۔'' چمنی پہلوان لالو بابا سے شکایت کررہا ہے۔ ''جتنا تم پر، مگر اب تمہیں بھی میری پروا نہیں رہی۔''

''ارے بھئی، ناراض کیوں ہوتے ہو، کہہ دیا نا، اگلی بار تمہارا جھگڑا شروع ہونے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔''

اُس کے ذہن سے اپنا سیلولر جیل کا پرانا مہربان سیٹونز اچانک گھومتے پھرتے برآمد ہوا ہے اور اُس سے رہا نہیں گیا ہے۔ ''آؤ تمہیں اپنے سیٹونز صاحب کے دنوں کی ایک کہانی سناتا ہوں۔''

''نہیں، وہ کہانی تم کئی بار سنا چکے ہو جب سیٹونز صاحب نے تمہاری طرف چاکلیٹ پھینکا تھا۔''





(۴)

بھائی شری رام کی عمر اب نوے کے قریب آ پہنچی ہے مگر آج بھی اُس کا ذہن حاضر رہتا ہے اور وہ نوجوانوں کو راہ پر لگنے اور بوڑھوں کو راہ کھود دینے کی تدبیریں سجھاتا رہتا ہے۔

''نوجوانوں کو راہ پر لگانے کی کوشش تو سمجھ میں آتی ہے بھائی، مگر بوڑھوں کو راہ کھود دینے کی ہدایت کیوں کرتے ہو؟''

''اس لئے کہ راہ کھود دینے کے دن آ پہنچیں تو جس انجانی راہ پر بھی نکل آئیں وہی اپنی۔''

پورٹ بلیئر کے سبھی بچے اور بوڑھے شری رام کو بھائی ہی کہا کرتے ہیں اور جسے جو بھی مسئلہ درپیش ہو وہ بےفکر سا رہتا ہے کہ بھائی جو ہے۔

بھائی شری رام اٹھارہ بیس سال کی عمر میں مہاراشٹر میں نوجوانوں کے ایک انقلابی گروہ کا سرغنہ تھا۔ اُس کا سنگل پوائنٹ پروگرام یہی تھا کہ انگریزوں میں دہشت پیدا کرتا رہے تاکہ وہ ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ کئی گاندھی وادیوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ سوتنترتا صرف اہنسا کے مارگ پر چل کر ہی پراپت ہوگی

مگر اُس نے بڑی سختی سے اپنے کام میں مداخلت سے پرے رکھا، یہاں تک کہ ایک گاندھی وادی نے اُسے زک پہنچانے اور پیش قدمی سے روکنے کے لئے انگریزی سرکار کے سامنے اُس کا کچا چٹھا کھول دیا۔ شری رام نے اپنے عقیدے کے مطابق موقع پا کر اُسے بھی گولی سے اڑا دیا اور بالآخر ایسے ہی کسی دہشت ناک کیس میں عمر قید کی سزا پا کر یہاں کالے پانی بھیج دیا گیا۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہاں پہنچنے کے دو ایک سال میں ہی یہ دہشت گرد اِتنا گاندھی وادی ہو گیا کہ اپنی بات منوانے کے لئے مسکراتے ہوئے آپ سے پٹتا رہے گا پٹتا رہے گا حتیٰ کہ آپ لاچار ہو کر کہہ اٹھیں، اچھا، بابا، بولو، کیا چاہیے؟

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ شری رام میں یہ تبدیلی آپ ہی آپ یکبارگی آ گئی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ پہلے ڈھائی سال کی کڑی قید کے بعد جب اُسے ایک اور جیل منتقل کر دیا گیا تو جن قیدیوں کے ساتھ اُسے کام پر بھیجا جانے لگا اُن میں ایک بڑا پکا گاندھی وادی بلدیو سنگھ بھی تھا۔ جسے انگریز سرکار ایک دہشت گرد بہروپیا سمجھتی تھی اور اُسے کسی کیس میں دھر لینے کی تاک میں لگی رہتی تھی۔ بلدیو سنگھ اپنے دکھ درد سے بے نیاز ہو کر ہمیشہ دوسرے قیدیوں کا درد بانٹتا رہتا تھا۔ اُس کے چہرے کے بے خوف سکوں نے جو شری رام کو ایک بار متوجہ کیا تو وہ اُس درویش سیرت انسان کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا۔

ایک دفعہ شری رام کو بخار سا محسوس ہو رہا تھا اور اُس سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک جنگل کاٹنے اور صاف کرنے کا کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ بلدیو سنگھ کو معلوم تھا کہ قیدیوں کی جانب سے اپنا دن بھر کا کام پورا نہ کر پانے کا کوئی جواز قبول نہیں کیا جاتا۔ وہ شری رام سے کہنے لگا، جاؤ، تم اُدھر بیٹھ کر آرام کرو، تمہارا یہ درخت بھی میں ہی کاٹ دوں گا۔

''مگر تم ——''

''میری فکر نہ کرو، میرا کام پورا ہو چکا ہے۔''

شری رام قریب کے ایک ٹیلے پر جا کر لیٹ گیا اور بلدیو سنگھ اُس کا کام

انجام دینے لگا۔ اِسی اثنا میں بدقسمتی سے وارڈن اُدھر نکل آیا، اور حسب عادت شری رام کو ٹھوکر مار کر اُس سے پوچھا، کام چھوڑ کر لیٹ کیوں گئے ہو؟

بلدیو سنگھ نے اُن کے قریب آ کر وارڈن کو بتایا کہ شری رام بخار میں مبتلا ہے۔

''تم کیوں اپنا کام چھوڑ کر چلے آئے ہو؟''

''میں اپنا کام پورا کر چکا ہوں اور اب اُس کا بھی کر رہا ہوں۔''

وارڈن نے آگے بڑھ کر پورے زور سے اُس کے منہ پر ایک مکا جڑ دیا، جس سے اُس کے دانتوں سے خون بہنے لگا۔ اُس دن وہ اُن دونوں کو ہتھکڑی اور بیڑیاں ڈال کر جیل میں واپس لایا اور اُن پر الزام عائد کر کے سیل میں ڈال کر بھوکے پیاسے بند کر دیا کہ اچانک بے وجہ مجھ پر چڑھ آئے تھے۔ بلدیو سنگھ وہ ساری رات شری رام کا سر اپنی گود میں لے کر ہتھکڑی سے بندھے ہاتھوں سے دھیرے دھیرے دباتا رہا۔

اُن دونوں کو ایک ہفتے کے لئے سیل میں بیڑیوں میں باندھ کر ہر روز بارہ گھنٹے ایک ٹانگ پر مسلسل کھڑا رکھنے کی سزا دی گئی، اور یہ کہ اُنہیں چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار آدھا کھانا اور پانی ملے گا اور کھانے کے فوراً بعد پیٹھ پر پانچ پانچ ڈنڈے رسید کئے جائیں گے۔ پہلے دن تو کھانے کی بجائے صرف ڈنڈا کھا کر شری رام بخار کی حالت میں بے ہوش ہو گیا، مگر دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو اُس کا بخار اتر چکا تھا اور وہ دانت پیس پیس کر بلدیو سنگھ کو بتا رہا تھا کہ آج جب وارڈن نے ہاتھ اٹھایا تو وہ بیڑیوں سمیت اُس پر کود کر اُسے ختم کر دے گا۔

''نہیں، شری رام، مقابلے کا ایک یہی طریقہ ہے کہ ہم دونوں ایک وقت کا کھانا لینے سے بھی انکار کر دیں۔''

سری رام ہنسنے لگا۔ ''اِس سے تو الٹا ہمارا ہی نقصان ہے۔''

''نہیں، ہماری بھوک ہڑتال سے یہ لوگ بھی ہماری بھوک محسوس کرنے

لگیں گے۔'' سری رام نے اُسے ٹوکنا چاہا مگر بلدیو سنگھ نے اُسے منع کرتے ہوئے کہا کہ ''نہیں، سری رام، کسی کی جان لینا بہادری نہیں، بہادری تو اوروں کو بچانے کے لئے اپنا بلیدان دے دینے میں ہے۔''

بھائی سری رام بڑے فخر سے سب کو بتایا کرتا ہے کہ میرے گورو بھائی بلدیو سنگھ نے مجھے بچالیا، ورنہ میں بھی اُن ظالموں سے کم نہیں تھا جنہوں نے اپنے اَتیاچار سے ہمارے دیش میں اپنے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ وہ اپنے گورو بھائی کا لہجہ اختیار کر کے اُسی کا یہ جملہ اکثر دہرایا کرتا —— بھوک اور بھے سے آزاد ہو کر اہنسا کی راہ پر جیون بسر کرو۔

۱۹۳۸ء کے آس پاس کا زمانہ تھا جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک خوب زوروں پر تھی۔ انہی دنوں ہندوستان میں یہ تحریک بھی زور پکڑ گئی کہ کالے پانی کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر کے واپس ہندوستان بھیج دیا جائے۔ بھائی سری رام اور اُس کے گورو بھائی کے نام اُس پہلے گروپ میں شامل تھے جن کی رہائی کے آرڈر ہو گئے تھے مگر اِن دونوں بھائیوں نے لالہ چھبیل داس کے مشورے پر وہیں پورٹ بلیئر میں رہنے کی ٹھان لی۔

انڈیمان کے لوگوں کے لئے لالہ چھبیل داس کا اپنا دم ہی بہت غنیمت تھا۔ اب بھائی شری رام اور بلدیو سنگھ کا ساتھ مل جانے پر گویا اُس کے اپنے ہی وجود سے چار اور ہاتھ برآمد ہو گئے اور اِن چھیوں ہاتھوں نے ہزاروں لوگوں کے دکھ سکھ کی دیکھ بھال کے لئے اتنا کام کیا کہ انگریزی سرکار کے جو افسر مین لینڈ میں اُن دنوں کے بدلتے ہوئے حالات میں ہندوستانیوں سے ہمدردانہ سلوک روا رکھنے لگے تھے وہ بھی عوامی فلاح و بہبود کے بعض معاملات میں اُن سے براہ راست مشورہ طلب کرنے لگے اور اُن پر اتنا بھروسہ کیا کہ پورٹ بلیئر میں انگریزی سرکار گرنے پر جب جاپانیوں نے حکومت کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے لی تو یہ تینوں بے گناہ انسان اُن کی انٹلی جنس رپورٹ کی بنیاد پر انگریزوں کے ایجنٹ قرار دیئے گئے اور اِنہیں بلیک لسٹ پر اتار لیا گیا۔

لالہ کو تو جاپانیوں نے اپنی پہلی چھانٹی میں ہی کوئی عذر پیش کئے بغیر دوسرے مقامی ہندوستانیوں کے ساتھ ایک لانش میں بٹھایا اور اِن سب کو کافی فاصلے پر سمندر کے اندر لے جاکر مچھلیوں کی خوراک کے لئے پانی میں پھینک دیا۔ اِس دل سوز واقعہ کے چند ہی ہفتوں بعد بلدیو سنگھ کو بھی پراسرار ماحول میں گھر بیٹھے شوٹ کروا کر ختم کر دیا گیا۔ ایک لالہ چھبیل داس کی موت سے ہی لوگوں کے سر رنج والم سے نہیں اُٹھ پارہے تھے، بلدیو سنگھ کی موت پر وہ اتنے جھک آئے جیسے دنیا میں اب کچھ دیکھنے کو رہ ہی کیا گیا ہے، مگر دنیا تو راجہ رام کے جانے کے بعد بھی ہوتے ہوتے ایسے لگنے لگتی ہے جیسے کوئی گیا ہی نہیں بلکہ سب کے سب چلے ہی آرہے ہیں۔

انڈیمان کے ہندوستانیوں کو پہلے تو یہی لگا کہ یہ محض افواہ ہے کہ سبھاش چندر بوس پورٹ بلیئر آرہے ہیں اور یہ کہ یہاں آکر اپنے ہاتھوں سے آزاد ہندوستان کا جھنڈا لہرائیں گے، مگر پھر جب جاپانی سرکار نے تصدیق کر دی کہ بوس واقعی وہاں ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو پہنچ رہے ہیں تو اُن کے جھکے سر از خود اوپر اُٹھ آئے اور انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ سارا دن ایک بڑے تہوار کی طرح جی لیا جسے ابھی آنا تھا، اور نئے نئے رنگ برنگے کپڑے پہن کر ترنگی جھنڈیاں لئے گھروں سے باہر نکل آئے، مانو آزادی کے بعد بس یہی ایک کام ہو کہ ہاتھوں میں جھنڈیاں لئے شادماں نعروں سے بدحال ہو کر گھومتے رہیں ـــــ ہندوستان زندہ باد! ـــــ

اِس موقع پر لالہ چھبیل داس اور بھائی بلدیو سنگھ کی روحیں عین بعین اپنا اپنا قالب پہن کر بھائی شری رام کے سر پر آکھڑی ہوئیں ـــــ اٹھو، بھائی! اِس طرح اوندھے پڑے ہمیں کب تک روئے جاؤ گے؟ ـــــ اٹھو اور ہنس ہنس کے اپنا کام کرو! ـــــ اور بھائی سری رام تن کر اٹھ بیٹھا، تاکہ سبھاش چندر بوس کا استقبال خوب شان و شوکت سے کیا جاسکے۔

سبھاش چندر بوس کسی زمانے میں بھائی سری رام کا واحد نیشنل ہیرو تھا اور اگرچہ اپنی حالیہ کایا کلپ کے بعد اُس نے ہنسا واد پر پہرہ بٹھا رکھا تھا مگر بوس کی نہتی

سچائی اور دوٹوک ردعمل نے اُس پر اتنا جادو کر رکھا تھا کہ اوروں کے ساتھ اُس کے منہ سے بھی بے اختیار بوس کی جے جے نکلی پڑتی تھی۔ بھگت سنگھ اور بوس کے دکھ اور تیاگ کا حساب کر کے تو مہاتما گاندھی جیسے اہنسا مورتی کی عقل بھی چکرا جاتی ہو گی کہ اُن دونوں کی سوچ اس قدر مختلف ہے، پھر بھی وہ اتنے سچے کیوں معلوم ہوتے ہیں۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۴۳، کو سبھاش چندر بوس نے جے ہند کے فلک شگاف نعروں میں آزاد ہندستان کا جھنڈا بلند کیا اور ہندوستانی قیدیوں کے اِس شہر میں آزادی کے ترنگے کو لہراتے ہوئے دیکھ دیکھ کر یہاں کے مکینوں کے اٹکے اٹکے سانس کُھل گئے اور وہ بھی گویا تین رنگوں میں ہوا میں لہرانے لگے، سرشار، کہ کُل ہندوستان میں سب سے پہلے وہی آزاد ہوئے جو بندی بنا کر یہاں کالے کوسوں بھیجے گئے تھے۔ انڈین انڈی پنڈنس لیگ نے بوس کے سہ روزہ قیام کے دوران ایک عالی شان تقریب کا انعقاد کیا جس میں جاپانی فوجیوں نے بھی حصہ لیا، حالانکہ وہ لیگ کے متعدد بے گناہ اراکین کو انگریزوں کی طرف سے مخبری کے الزام میں قتل کر چکے تھے۔ جاپانیوں نے بوس کو اِن سانحات سے بے خبر رکھنے کے لئے ہر احتیاط برتی، اور اپنے مختصر قیام میں بوس بھی بے خبر سا نظر آتا رہا، تاہم بھائی سری رام اور لیگ کے کئی دوسرے ذمہ دار لوگوں کی موجودگی میں اُسے مقامی صورت حال کا جائزہ کیوں کر نہ ہوا ہو گا؟ اُس نے شاید اِس لئے بے خبری کا بہروپ بھرے رکھا ہو گا کہ مقامی صورت حال پر کوئی تنازعہ کھڑا کر لینے سے کہیں جاپانیوں سے وسیع تر طے شدہ غیر مقامی معاملات میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو جائے، دوسرے، اُسے معلوم ہی ہو گا کہ کافی ہندوستانی تنخواہ دار جاسوس انگریزوں کے لئے کام کرتے ہیں۔

سننے میں آیا ہے کہ بھائی سری رام کو بھی ختم کر دینے میں جاپانی سربراہوں کو تامل نہ تھا، مگر بوس کی آمد کے بعد وہ اپنے اِس پلان کی تکمیل میں محتاط ہونے لگے، چنانچہ بقیہ مشکوک ہندوستانیوں کو ختم کرنے کا کام پہلے تو ٹلتا چلا گیا اور پھر چند ماہ بعد جاپانی انٹلی جنس کے اندازے پر غلطی کا احساس بھی ہونے لگا، سو اس کا نام بلیک لِسٹ

میں پھیکا کر دیا گیا۔

بہر حال ۱۹۴۵ء میں انڈیمان میں انگریزوں کے دوبارہ قبضے تک جاپانیوں نے بھائی سری رام اور دوسرے بہت سے ہندوستانیوں پر اپنی نظر بدستور رکھے رکھی، اور انگریزی قبضے کے بعد جب انگریزی سلطنت اور مین لینڈ کے ہندوستانی اماموں میں حکومت کی باگ ڈور ہندوستانیوں کو سونپنے کی بات چیت شروع ہونے لگی تو ایک روز اچانک بھائی سری رام نے ایک جلسے میں ایسے اعتراضات کئے جو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھے۔

بھائیو اور بہنو اور عزیزو، سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سورگیہ سبھاش چندر بوس اور مہاتما گاندھی ایک دوسرے سے یکسر الگ نظریوں کے باوجود میرے نزدیک ہمارے سب سے بڑے ہیرو ہیں، مگر سوال اگر نظریوں کی قبولیت کا ہو تو گاندھی کے نظریے پر ہی پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ انگریز ہمارے اہنسا کے ہتھیاروں کا لوہا بالآخر محسوس کرنے لگا ہے اور جیسا کہ بھائی بلدیو سنگھ ہمیں بتایا کرتے تھے، انگریز کا ضمیر عنقریب ہڑبڑا اٹھے گا، اور وہ ہمیں ہمارا دیش لوٹا کر اپنی راہ لے گا ـــــ لیکن میرے عزیزو، اگر ہم اپنی آزادی کے لئے جاپانیوں کے محتاج ہو کر رہ جاتے تو یوں نہ ہو پاتا۔ یہاں جاپانیوں کے مختصر سے دور حکومت میں ہمارا کیا تجربہ رہا ہے؟ اُن کے مزاج اور رویے اور ارادے کو پہچان کر ہمارے شکوک میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

میں اور میرے ساتھیوں کے صبر کا پیانہ آخر لبریز ہو گیا میرے دوستو، ہمیں یہی فکر کھائے رہتی تھی کہ عالمگیر جنگ کے بعد اگر وہ فتحیاب ہو گئے تو اُن سے ہماری آزادی کی وہ جنگ ابھی شروع ہو گی جو ہم انگریزوں سے لڑ کر تقریباً جیت چکے ہیں ۔ یہ وچار صرف میرے، یا لالہ چھبیل داس کے یا بھائی بلدیو سنگھ کے ہی نہیں، مہاتما گاندھی بھی ہمیں کئی بار یہی بتا چکے ہیں۔

میرے عزیزو، اپنی اِس سوچ کے باوجود میں شاید کسی ایسے اقدام کا

مرتکب نہ ہوتا، جو ہوا، لیکن جب جاپانیوں نے ہمارے بے شمار بے گناہوں کو اپنے بے جا شکوک کا نشانہ بنانا شروع کر دیا اور لالہ چھبیل داس اور بھائی بلدیو سنگھ کو بھی بے قصور مروا دیا تو میرا اور میرے ساتھیوں کے صبر کا پیالہ بھر گیا اور ہم سوچنے لگے کہ کیوں نہ ہم واقعی انگریزوں کے مخبر بن کر جاپانیوں سے اپنی رہائی کی تدبیر کریں، اُس وقت تک برابر کرتے رہیں، جب تک یہاں سے جاپانیوں کے پاؤں نہ اُکھڑ جائیں۔

میرے نہایت عزیز ہم وطنو، ہم نے اِس کا بیڑا اپنے ضمیر کی آواز پر اٹھایا تھا۔ مگر میری گردن حاضر ہے اور تمہیں پورا اختیار ہے کہ اِسے کاٹ دو، یا مجھے یقین دلاؤ کہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔

سامعین نے چند لمحے اپنے نہایت نیک اور ہر حاجت مند پر جان چھڑکنے والے انسان کی جھکی ہوئی گردن پر نظریں جمائے رکھیں اور پھر کسی نے اپنی کانپتی ہوئی بلند آواز سے خاموشی کو توڑا —— بھائی سری رام! —— اور اُس آواز پر ایک ایک نے لبیک کہتے ہوئے پورے زور وشور سے جواب دیا، زندہ باد! ——

اور پھر جو اِس نعرے کی تکرار شروع ہوئی تو ختم ہونے میں نہ آ رہی تھی —— زندہ باد!

(۵)

مولوی منظور احمد اگلی صبح لالو بابا کے پاس آ پہنچا ہے۔ لالو بابا تیار ہی بیٹھا ہے۔ جالم سنگھ بھی وہیں آیا ہے۔ اُس نے خواہش ظاہر کی ہے، چلو، میں بھی تمہاڈے ساتھ چلدا ہوں۔ وہ تینوں گھر سے باہر نکلنے لگے ہیں کہ گوراں کی آواز نے اُن کا تعاقب کیا ہے۔ سنو، بابا، بھائی سری رام سے میرا بھی پرنام کہنا اور میری طرف سے شکایت کرنا، میرے گھر کا کھانا کھائے اُسے پورے تین ماہ ہو گئے ہیں——— اتنے میں تسلی نہ ہونے پر وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلی آئی ہے۔ اور کہنا، نوکر کے ہاتھ کا کھانا ہی اُسے اچھا لگتا ہے تو مجھے بھی اپنا نوکر سمجھ کے چلا آئے۔

''ہاں، ہاں، بی بی، جاؤ، اندر جاؤ۔''

ڈیوڑھی میں گونگی بڑھیا کو اپنے کمرے کے دروازے پر بیٹھے دیکھ کر مولوی منظور احمد نے اُسے سلام کیا ہے تو گونگی بڑھیا کو غوں غاں کرتے ہوئے پا کر جالم سنگھ نے ہنس کر مولوی منظور کو بتایا ہے، وہ پوچھ رہی ہے مولبی، سلام دوا کے بگیر ہی نکل جاؤ گے؟

قصوں والی گلی سے باہر نکلنے سے پہلے انہوں نے شبو چور کو اپنے

دروازے پر بیٹھے دیکھا ہے، جالم سنگھ نے اُسے مخاطب کیا ہے۔ ''اوئے چورا، اپنے گھر کے اندر بیٹھا کر۔''

''اندر میرا کون ہے؟''

''اوئے تو آپ گھدتو اے۔'' جالم سنگھ کے ساتھ ساتھ بابا اور مولوی بھی وہاں ٹھہر گئے ہیں۔ ''تو چاہوے تو اپنے واہگورو کو تیرے پاس بھیج دیا کروں گا۔''

مولوی منظور اُس سے السلام علیکم، کہہ کر اُس کی طرف بڑھ آیا ہے۔

شبو چور نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا ہے۔ ''یتیموں کی امانت میرے ہی پاس رکھی گئی ہے مولوی منظور۔ میں کل پرسوں آ کر دے جاؤں گا۔''

آس پاس ہی رکھی ہے تو ابھی دے دو۔'' مولوی منظور احمد نے اُس سے کہا ہے۔

''مجھے یاد نہیں، کہاں رکھی ہے ڈھونڈ کر لے آؤں گا۔''

''شکر کر چورا، اپنا آپ ہمیشاں اپنے ساتھ رکھنا پڑتا اے۔ نئیں تو اُسے بھی کتھے رکھ کے بُھل جائے۔''

''جلدی چلو۔'' بابا نے مداخلت کی ہے۔ ''بھائی ہماری راہ تک رہا ہوگا۔''

بھائی شری رام کا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ اِس لئے راستے میں رکتے رکتے بھی وہ کوئی پندرہ بیس منٹ میں وہاں جا پہنچے ہیں۔ حکیم کرشن دیو پہلے سے ہی وہاں پہنچا ہوا ہے اور شری رام کی نبض ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔''

بھائی شری رام نے اُنہیں دیکھ کر اپنا منہ کھولنا چاہا ہے۔ لیکن حکیم نے اُسے منع کر دیا ہے۔ ''جب تک میں تمہاری نبض ہاتھ میں لئے ہوئے ہوں بھائی، بولو، نہ سنو۔''

بھائی نے پورا منہ کھول کر اُسے جواب دیا ہے۔ ''تم کوئی انگریز تو نہیں، جس نے صدیوں ہماری نبض پکڑے رکھی اور بولنے نہیں دیا''۔ وہ ہنس دیا ہے۔ ''میں

نے تمہیں سنا نہیں حکیم، اس لئے بول رہا ہوں - کہو، لالو بابا، کیسے ہو؟ اتنے سنجیدہ کیوں نظر آرہے ہو؟''

''بابا کو اب مالوم ہو یا اے بھائی، اس لئی سنجیدہ اے۔'' جالم نے اُسے جواب دیا ہے۔ ''مجھے تو پہلے ہی مالوم تھا۔''

''بیٹھو، کیا معلوم ہوا تھا؟'' بھائی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ''مجھے کل چیک اَپ کر لینا حکیم کرشن دیو۔'' بھائی اپنے گھر میں اکیلے اپنے باورچی پرمیشر کے ساتھ رہتا ہے۔ اُس نے اُسے آواز لگائی ہے۔ ''پرمیشر، پانی لاؤ اور چائے تیار کرو۔''

''بھائی۔'' جالم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکا ہے۔ ''تہاڈا پرمیشر تو بڑے کام کا اے، دیتا بھی سب کچھ وہی اے اور دینے کے لئے تیار بھی کرتا اے۔''

''تو پھر تیار تم جا کے کردو جالم سنگھ۔''

''ہاں، جے ٹھیک اے، تم باتاں کرو، میں چائے تیار کرتا ہوں،'' وہ وہاں سے اُٹھ کر شری رام کے باورچی خانے کی طرف چلا گیا ہے۔

چند ہی لمحوں میں پرمیشر کو پانی لاتے ہوئے دیکھ کر شری رام نے کہا ہے۔

''لو، پہلے پانی پیو۔''

پانی پی کر مولوی منظور احمد نے پنڈت تلسی دھر کی ساری بات کہہ سنائی ہے۔ بھائی شری رام نے اُسے بغور سن کر اپنی رائے دی ہے۔ ''میں پچھلے کئی ماہ سے پنڈت تلسی دھر کے قصے سن رہا ہوں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اُس کے خلاف ایک باقاعدہ مہم چلائی جائے، مگر میری اطلاع کے مطابق وہ اکیلا نہیں ہے۔ مین لینڈ کے دکاندار بھی اُس سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ ایسے میں ـــــــ''

''مگر اُنہیں روکنا بہت ضروری ہے۔''

''نہیں، پہلے میری پوری بات سن لو، مولوی منظور۔ یہی تو وہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہماری ایک ہی صف دو صفوں میں بٹ کر رہ جائے۔ ہم اُن کے ہاتھوں میں کیوں کھیلیں؟''

''یعنی؟——''

''یعنی، یہ بابا، کہ ہمارے سارے لوگ آج ایک ہیں۔'' اپنے الگ الگ مذہبوں کے باوجود ایک، یہ چند اشخاص جیسے بھی بنے، ہمارے عوام کی دوئی کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اِس اعلان میں اُن کا ساتھ کیوں دیں؟۔'' بھائی شری رام نے اپنی اونچی ہوتی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا ہے۔'' مجھے یقین ہے لالو بابا، ان لوگوں کی بگڑی ہوئی بین ہمارے پورٹ بلیئر میں کسی کو راس نہیں آئے گی۔''

''تمہیں شاید معلوم نہیں بھائی۔'' مولوی منظور احمد نے اُسے ٹوک کر کہا ہے۔'' اس کھیل میں صرف غیر مقامی لوگ ہی شامل نہیں۔ ہمارا ایشر سنگھ اور اُس کے جماعتی بھی ان کی بگڑی بین پر پھن پھیلا چکے ہیں۔''

بھائی شری رام کو معلوم ہے کہ ایشر سنگھ نے آئندہ الیکشن میں اپنی ہوا باندھنے کی تیاری ابھی سے شروع کر رکھی ہے۔

''ایشر سنگھ کو سمجھانا بجھانا لا حاصل ہے مولوی منظور۔ میری رائے تو یہی ہے کہ محتاط ضرور رہو مگر ابھی اِس معاملے میں الجھو نہیں۔ بس، ذرا فاصلے پر اپنی زمین پر مضبوطی سے پیر جمائے رکھو اور اِس طرح اُنہیں ہوا میں تلوار چلا چلا کر تھک جانے دو۔ تھک کر یہ ستیاناسی آپ ہی گر جائیں گے۔''

لالو بابا نے بھائی سے متامل سے اختلاف کا اظہار کیا ہے۔''میرا تو خیال ہے بھائی، یہ ستیاناسی اتنی آسانی سے تھکیں گے، نہ گریں گے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا——''

''وہ بھی کریں گے بابا—— پَینِک سے کام مت لو۔''

اتنے میں جالم سنگھ چائے کا ٹرے لے کر آ گیا ہے۔

''میں بھی بابا کو جے ہی سمجھاتا رہتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں، پَینِک سے کام مت لو۔ جرا سی گل پر گھبرا جاتا اے۔''

''بات گھبرانے کی ہی ہے جالم سنگھ۔'' بھائی نے اُسے پیالوں میں

چائے ڈالنے کا اشارہ کیا ہے۔ ''پر اِس وقت ہوش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔''

بھائی شری رام اُنہیں سمجھانے لگا ہے کہ اصل خطرہ پیشہ ور کارکنان سے درپیش نہیں ہوتا جو وقتی فائدے اور سہولت کی خاطر بھٹک جاتے ہیں: اصل خطرے میں دراصل کسی ایسے واحد فرد کا حصہ بھی کافی ہوتا ہے جو بڑی ایمانداری سے گمراہ ہو کر اپنی جان کی بازی بھی کھیل جائے۔ ایسے شخص کو روکنے کی تدبیر اکثر کارگر نہیں ہوتی اور خطرہ ہوتے ہوتے اجتماعی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ خوش قسمتی سے حالیہ صورت حال میں پورٹ بلیئر کو کوئی ایسا بنیادی خطرہ لاحق نہیں۔

لالو بابا نے اچانک کچھ سوچ کر بھائی شری رام سے پوچھا ہے۔ ''تمہیں ویرساورکر یاد ہے بھائی؟''

''ارے! اُسی کے بارے میں سوچ کر تو میں اپنی بات کر رہا تھا۔''

ویرساورکر کی ذہنی جھلک پانے کے لئے بھائی شری رام ذرا سا رکا ہے اور پھر ہمیں بتانے لگا ہے کہ صرف اپنے آدرش کی ضد میں ستائیس سال کی کالے پانی کی دو لائف ٹرمیں بھگتنا کوئی تماشہ نہیں، بعضوں کی شکایت ہے کہ آخر آخر میں ویرساورکر ٹوٹ گیا تھا۔ جو شاید غلط نہیں، مگر ٹوٹ ٹوٹ کر بھی وہ اپنے پیروں پر کھڑا رہا۔ اُس نے ذرا رک کر پھر شروع کیا ہے۔ ایک دن ہم دونوں قیدی ساتھ ساتھ لیبر میں جتے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں وہ اپنے بڑے بھائی کا ذکر لے بیٹھا۔ اُس کا بھائی بھی ایک بہت بڑا سوتنتر تا سینک تھا۔ وہ بہت دیر تک اپنے بھائی کے چھوٹے چھوٹے قصے یاد کر کے مجھے بڑے پیار سے سناتا رہا اور پھر جانتے ہو، بابا، اُسی شام کو کیا ہوا؟ —— اُسے پتہ چلا —— نہیں، پتہ کیا چلا، اُس کا بھائی —— ہاں، اُس کا وہی بڑا بھائی خود آپ سیلولر جیل کے برآمدے سے گزرتے ہوئے اُسے دِکھ گیا —— بھیا! —— وہ اس کے پیچھے کچھ اِس مانند بے اختیار دوڑا جیسے جیل سے بھاگنے کی کوشش میں ہو۔ کئی وارڈن اپنی لاٹھیاں اور بندوقیں لئے اُس کے پیچھے بھاگے اور دونوں بھائیوں کے گلے ملنے سے پہلے ہی اُسے جالیا —— اور —— اور ——''

بھائی شری رام کا سانس پھول گیا ہے۔ حکیم کرشن دیو نے اُسی کا پانی کا گلاس اپس کی طرف بڑھا کر کہا ہے —— ''ذرا آرام کرلو بھائی، تم ابھی کافی کمزور ہو۔''

''مجھے بیمار کرنا چاہتے ہو؟'' اُس نے ہنس کر جواب دیا ہے۔ ''دیکھتے نہیں، میں گرم گرم چائے پی رہا ہوں؟ —— اپنی بات کو پورا کرنے کے لئے وہ ذرا ٹھہر کر پھر اُن سے مخاطب ہو گیا ہے۔

''ویر ساورکر کی شخصیت کے دو پہلو مجھے بہت کھٹکتے تھے۔ نمبر ایک، کہ ہم مسلمانوں کو بے جا خوش رکھنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ میں نے اُسے جواب دیا تھا، کیوں کہ ہم بڑے بھائی ہیں ویر جی۔ ذرا سوچ کر بتایئے، آپ کے یہی بڑے بھائی، آپ کو بے جا خوش رکھنے کی کوشش کیوں کرتے رہتے تھے ——''

اور دوسرا پہلو؟'' بابا نے اُسے خاموش پا کر پوچھا ہے۔

''اور دوسرا یہ، کہ ساورکر ہنسا کے بغیر انگریزوں سے لڑنے کی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے اُسے بتایا، دیکھئے ویر جی، میرا ابھی کئی سال یہی خیال رہا کہ میرے سر میں صرف بندوق رکھی ہے، مگر ایک دن میں نے ٹٹول کر جو دیکھا تو وہاں صرف میرا دماغ تھا جس سے سوچنا مجھے یاد ہی نہ رہا تھا ——''

''اوئے بھائی، تُو تو میرے واہگورو کی تراں باتاں کرتا اے، میں اُسے بتاؤں گا تو وہ بہت خُوش ہوگا۔

(۶)

سُو جاروانسل کی ایک لڑکی ہے جس کے دادا دادی کو ایک انگریز افسر بیسویں صدی کے اوائل میں پورٹ بلیئر کے کسی جنونی جزیرے کے گھنے جنگل سے اِس لئے نکال لایا تھا کہ اُنہیں پالتو سا بنا کر اپنے گھر کے کام کاج کے لئے رکھ لے۔

انگریز افسر کی خواہش کے عین مطابق سُو کے دادا دادی دو چار سال ہی میں سِدھ کر اتنے کارآمد ہو گئے کہ وہ اُنہیں بڑے فخر سے اپنے ہم قوم ملاقاتیوں کے سامنے ایسے پیش کرتا جیسے اپنے پالتو کتے ٹامی کو، جو اُس کا پھینکا ہوا گیند منہ میں پکڑ کر بڑے ادب سے اُس کے روبرو ڈال دیتا تھا اور ڈال کر ملاقاتیوں کی تالیوں کے درمیان اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر مالک کو سلام بھی کرتا تھا۔

''کوکھ سے نکل کر پیدا تو ہونا ہی پڑتا ہے کرسٹی، چنانچہ اُن کی ڈیلوِری کا ٹائم بھی آ گیا تو وہ آ گئے۔'' دادا دادی کا مالک راکسَن اپنے دوستوں کو بتاتا۔ ''آؤ، دیکھو وہ ہماری انگریزی بھی کتنی صاف بولنے لگے ہیں——

''واٹ اِز یورَ نیم، بے بی؟''

''مائی نیم از جوکوئی، سَر۔''

''واٹ ڈُو یُو ڈُو ، بے بی؟''
''آئی ایم اے کُک ،سر۔''
''اینڈ واٹ آر یو، ڈارلنگ؟''
''آئی ایم اے ہاؤس میڈ، سر''
راکسن کا کمرہ اُس کے ملنے والوں کی تالیوں سے گونجنے لگتا، ''کمال ہے! جاروا بھی ہماری مانند بول لیتے ہیں۔''
''ناؤ گو بیک ٹُو یوئر ورک، بے بیز۔''
سُو کے دادا دادی کو اپنے انگریز آقا سے بس یہی ایک شکایت تھی کہ وہ ہمیں اپنے ہی مانند انسان نہیں سمجھتے، بڑی محبت سے پیش آتے ہیں، پر یہی سمجھتے ہیں کہ ہم ذی جانوں کی کوئی اور نوع ہیں جن سے اُنہیں اچھی طرح پیش آنا چاہئے، تاکہ ہم وفاداری سے اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔لو، ٹامی، اور بریڈ لو گے؟——لو، یہ اور لو!
سُو کے دادا دادی کی وفات کے بعد اُس کے ماں باپ بھی اُس وقت تک راکسن کے یہاں کام کرتے رہے۔ جب تک راکسن اپنی ریٹائرمنٹ پر انگلستان نہ لوٹ گیا۔ اپنی روانگی سے پہلے وہ سُو کے باپ کو کسی سرکاری کام پر بھی جٹا گیا۔
فی الوقت جو ہے وہ یہ، کہ سو علی کے اسکول سے ہی میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ٹورسٹ گائیڈ بن گئی ہے اور اپنے ماں باپ کی وفات کے بعد ایک لیڈیز ہوسٹل میں رہ رہی ہے۔ اُس نے علی کے اسکول میں ہی تعلیم پائی تھی اور انہی دنوں سے علی کے بہت قریب کھنچ آئی تھی، اور اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ ہندوستانی اور جاروا دراصل ایک ہی لوگ ہیں جو اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے اوروں کے وضع کردہ سہولتی اصولوں کے پابند ہیں۔

''نہیں، سُو۔'' علی بحث میں الجھ جاتا۔ ''تم نہیں جانتیں کہ ہندوستانی بھی دو قسم کے ہیں، مقامی، اور وہ، جو مین لینڈ سے آکر ہم پر ویسے ہی حکومت کر رہے ہیں، جیسے انگریز کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ بھی ہماری اوریجنل ضرورتوں سے ویسے ہی نابلد ہیں

جیسے اِن کے انگریز آقا اِن کی اوریجنل لائف سے۔''

اپنے معصوم استاد کی بے چینیاں سُو کا من موہ موہ لیتیں، مگر وہ اپنے فطری مادرانہ تحفظ سے اُسے ٹوک دیتی۔ ''نہیں مائی ڈیئر ٹیچر، یہ سچائی تم مجھ سے معلوم کرو کہ ہر شخص اولین ضرورت، صرف وہ خود آپ ہی جانتا ہے، مثلاً——''

''مثلاً یہ، کہ کسی اور کو کیا پتہ، تم کیوں کر میری اولین ضرورت ہو——'' اُسے اپنی طرف جھکتے ہوئے پاکر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کے بے اختیار اپنے بازوؤں میں لے لیتا، گویا یہ سوچ کر، کہ جو ہو سو ہونے دو، میری اپنی بنیادی ضرورت پوری نہ ہوئی تو میں بنجر ہو کر رہ جاؤں گا۔

علی نے اپنی محبوبہ کو اے بی سی تو سکھائی تھی مگر زندگی کی اے بی سی سیکھنے کے لئے وہ اپنی شاگرد کا محتاج تھا، جس کی چھاتیوں پر گویا وہ کسی شیر خوار کی طرح منہ لگائے ہوتا۔ اب اُسے لگتا ہے کہ وہ اُسے بڑے سے بڑے خطرے سے بچانے کے لئے اپنی جان کو بھی داؤ پر لگا دے گی، اور اب، کہ اس جار والڑکی کو کیا معلوم کہ زندگی کتنی پیچیدہ ہے۔ کتنی بے ظرف اور بے بس! اُس وقت وہ اُسے ہر بپتا سے بچائے رکھنے کا یقین دلانے لگتا—— مجھے اپنے اصول بہت عزیز ہیں، سُو، لیکن تم میرا سب سے بڑا اصول ہو۔ صرف یہی ایک اصول نبھانے کے لئے مجھے کوئی بھی لڑائی مول لینے میں باک نہ ہوگا۔

علی نے آج شام کے لئے سُو سے طے کر رکھا ہے کہ وہ دونوں چھ بجے انٹرٹین مینٹ کے ہال میں ملیں گے، مگر اب ساڑھے چھ سے بھی اوپر ہو لئے ہیں۔ وہ ہال سے اٹھنے کی ہی سوچ رہا تھا کہ سُو اُسے ہال کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے نظر آئی ہے۔

''میں تو مایوس ہو چکا تھا——'' سُو نے اُس کی جانب قدم اٹھایا ہے تو علی کی آواز آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گئی ہے۔

''اِتنی دیر کیوں کر دی؟'' وہ اُس کے ساتھ آ بیٹھی ہے تو اُس نے پوچھا

ہے

''تم بھول کیوں جاتے ہو کہ میں اسکول ٹیچر نہیں ہوں جو جب چاہوں سٹوڈنٹس کو ڈانٹ کر مزے سے چپ سادھ لوں —— '' اُس نے ہنس کر کہا ہے۔

''ٹورسٹ گائیڈ ہوں اور مجھے اُس وقت تک بولتے چلے جانا ہوتا ہے جب تک ٹورسٹ سننا نہ بند کر دیں۔ مگر آج —— پتہ ہے؟ —— کیا ہوا؟ مجھے ایسے ٹورسٹوں سے واسطہ پڑا جو میری سننے کی بجائے اپنی ہی سناتے چلے گئے''۔

''ہاں اور میری خاموشی کی دگنی فیس دی''۔ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے وہ گویا اپنے سر کا بوجھ اتار رہی ہو۔ ہندوستانی بڑے بور لوگ ہیں۔ اِتنا بولتے ہیں اور بولتے بولتے خود کو اتنے دھیان سے سنتے ہیں گویا ساری دنیا وہ خود آپ ہی ہوں۔''

''ہہ ہاہہ —— ! کیا بول رہے تھے؟''

''میں سن کہاں رہی تھی؟ میں تو انتظار کر رہی تھی کہ وہ چپ ہوں تو میں اُنہیں بتاؤں جو وہ اِتنی دور سے دیکھنے آئے ہیں —— ''

ہہ ہا —— !

''تم ہنس رہے ہو، مگر اُنہیں نہایت غور سے سننے کو پوز بنا بنا کر میری جان پر بنی ہوئی تھی —— آخر جب ہم فری ڈم فائٹرز کی تصویروں کی گیلری پر آ پہنچے تو میں نے انہیں ذرا سا چپ پا کر کہا، آیئے میں آپ کو ان سب کے بارے میں بتاؤں، مگر جواب میں کسی نے میرا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا، ہم نے سنا ہے کہ یہاں بعض نہایت خوبصورت ٹورسٹ سپاٹ ہیں۔ کل آپ وہی جگہیں دکھایئے —— مجھے تو یہ محسوس ہوا علی۔'' اُس نے علی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''کہ میرا انڈیمان دیکھنے کی بجائے وہ مجھے اپنا ہندوستان دکھانے یہاں تشریف لائے ہیں۔ ایک صاحب زادہ تو شاید صرف مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اُس نے مجھے ذرا الگ لے جا کر آج رات کو اپنے ہوٹل میں کھانے پر بھی دعوت دے دی اور یہ دیکھو۔'' اُس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اُسے دکھایا ہے۔ ''یہ اتنا بڑا نوٹ بطور ٹپ میری ہتھیلی میں تھما دیا۔ میں نے اِس لئے یہ پیسے رکھ لئے

کہ اُس کی بدتمیزی کا اتنا جرمانہ تو ہونا ہی چاہیے۔''

''یہ بہت گھٹیا لوگ ہوتے ہیں۔ انہی لوگوں سے نمٹنے کے لئے تو لوکل بارنز ایسوسی ایشن اِتنی امپارٹنٹ ہے۔'' علی نے اپنی کرسی گھسیٹ کر بالکل اُس کے ساتھ لگالی ہے۔ ''ہم مقامی لوگ اپنے ہی ملک کے اِن غیر مقامیوں سے نہایت مختلف ہیں۔''

''ہم جیسے بھی ہیں بھئی، بھوکا ہونے پر اُنہی کی طرح صرف بھوک محسوس کرتے ہیں۔''

سُو علی کی شاگرد ہونے کے باوجود اُس سے دو چار سال بڑی ہی ہے اور اتنی ذہین اور چست بیان ہے کہ پِٹ سن اُس سے پوچھا کرتا ہے کہ سُو کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائے۔ سُو کا ذکر چھڑ جانے پر وہ اکثر علی سے کہا کرتا ہے، صرف پڑھ پڑھ کر جان لینے سے ہم شاید انجان ہی رہ جاتے ہیں ینگ مین، زندگی کی اصل جان پہچان تو زندگی کر کر کے ہوتی ہے۔

علی نے کھانے کا آرڈر دینے کے لئے بیرے کو بلایا ہے۔

''ماش کی دال اور تنوری روٹیاں اور —— ''

''اور بس''

علی کو معلوم ہے کہ سُو کے منہ میں ماش کی دال کا ذائقہ گھلنے لگے تو وہ کُل دنیا کو بھول جاتی ہے۔

''ماش کی دال میں ایسا کیا رکھا ہے سُو؟''

''تم!'' سُو نے اُسے جواب دیا ہے۔ ''جب میں نے پہلی بار تمہاری ماں کے ہاتھ کی ماش کی دال کھائی تھی تو مجھے پتہ چلا تھا میں جاروائی بیٹی ہونے کی بجائے ہندوستانی بہو ہوں۔''

''تو پھر اب جھٹ پٹ بہو کیوں نہیں بن جاتیں؟''

''بیوی اور بہو بننا دل سے ہوتا ہے، شادی میں قسمیں کھالینے سے نہیں —— ''

ماش کی دال اور روٹیاں بیرا جھٹ سے لے آیا ہے۔

''قسمیں کھا لینے سے منہ میں ماش کی دال تھوڑا ہی بھر آتی ہے، چلو اِس وقت تو مزے سے کھانا شروع کرو، جب شادی کریں گے، شادی بھی کر لیں گے۔''

''پٹ سن انکل بھی پوچھ رہے تھے سُو، اب جلدی سے دونوں بندھ کیوں نہیں جاتے۔''

''کھلے کھلے بھی بندھے رہیں تو کیا برا ہے؟'' سُو نے منہ میں روٹی سے زیادہ ماش کی دال بھر لی ہے۔ ''میں دیکھنا چاہتی ہوں تم میرا کتنے دن انتظار کر سکتے ہو۔''

''آل مائی لائف، سُو —— آل مائی ——!''

''تو پھر ابھی تو زندگی شروع بھی نہیں ہوئی، اِتنی جلدی کیوں؟ سُو نے اچانک یاد آ جانے پر اُس سے پوچھا ہے۔ ''کل ہمارے لوکل بارنز کی میٹنگ کتنے بجے ہے؟''

''پانچ بجے۔ بڑا اہم ایجنڈا ہے ——'' سُو بھی لوکل بارنز ایسوسی ایشن کی ممبر ہے۔ ''کسی ٹورسٹ کے چکرّ وکرّ میں نہ پھنس جانا۔''

''ہاں، پنڈت تلسی دھر کا یہ معاملہ کیا ہے؟''

''معاملہ کیا ہونا ہے؟ سیٹھ گردھر اور تلسی دھر یہاں بھی ویسے ہی فرقہ وارانہ فساد جگانا چاہتے ہیں۔ جو اُن کے قبیلے نے مین لینڈ میں بپا کر رکھے ہیں۔'' علی کھانا بھول اُسے ساری تفصیلات بتانے لگا ہے۔ ''اگلے ہفتے اُن کی دعوت پر کوئی چکرورتی مین لینڈ سے یہاں آ رہا ہے۔ وہ ہمیں سمجھائے گا کہ ہندو اب متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں اور دشمنوں کو ایک ایک کر کے ٹھکانے لگائیں ——''

''وہ دشمن ——؟''

''ہمارے بھائی بہنیں، ماں باپ —— اُن کے نزدیک میرا بھائی بیکل میرا دشمن ہے، میری ماں، تم —— سب دشمن ہیں، میں ایک آپ ہی اپنا دوست

ہوں۔"

"ایسا!——— ہمیں اِن لوگوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے علی۔"

"ہاں، سُو، میرا بس چلے تو اِنہیں گولی سے اڑا دوں، یہ بھی کوئی بات ہے کہ چین سے پھلتے پھولتے سماج کو یکلخت پھونک کر رکھ دیا جائے۔"

(۷)

لوکل بارنز ایسوسی ایشن کے انتظامیہ کی میٹنگ کا انعقاد عین وقت پر ہوا ہے۔اراکین پورٹ بلیئر کے مقامی نوجوانوں اور چند ایک لڑکیوں پر مشتمل ہیں۔ میٹنگ دو ڈھائی گھنٹے تک چلتی رہی ہے اور اتنی گپت رکھی گئی ہے کہ کسی کو خبر نہیں، کیا فیصلے کئے گئے ہیں۔

ہاں، جب اراکین میٹنگ کمرے سے باہر نکلے ہیں تو اتنے گمبھیر نظر آرہے ہیں جیسے انہوں نے پنڈت تلسی دھر کے جلسے کے تعلق سے بعض نہایت سنجیدہ اور اٹل فیصلے کئے ہوں۔

ہر سوال پر اُن کے ہونٹ پھڑک کر رہ جاتے ہیں، اور غصے کی شدت میں منہ سے نکلی ہوئی آوازوں کو سن کر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو بھی ہوگا دیکھ لیں گے، پنڈت چکرورتی نے الٹی سیدھی ہانکنا شروع کردی تو اُسے بولنے نہیں دیں گے۔

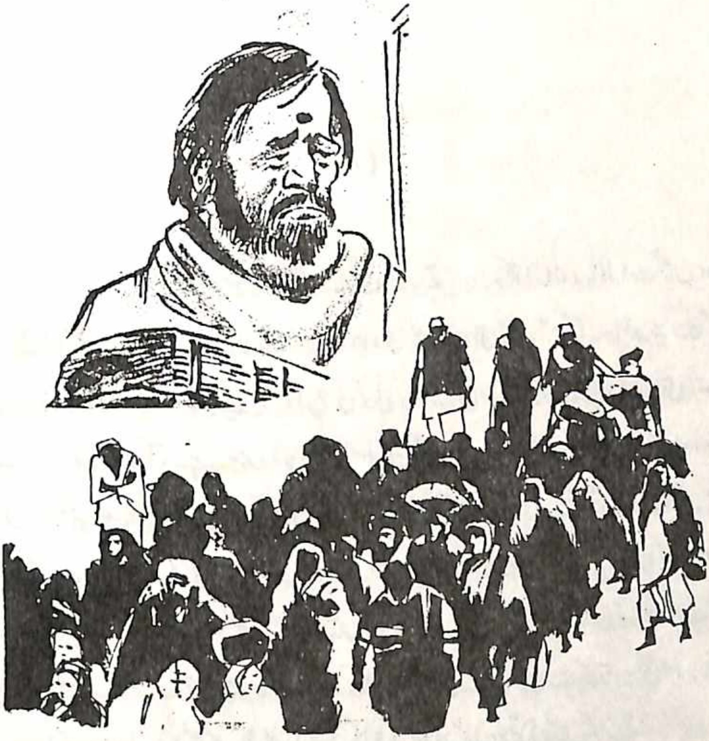
مگر کیسے؟

جیسے بھی!

(۸)

جس عمل کو ہم موجودہ کلچر سے تعبیر کرتے ہیں وہ کنوارا اور بالذات نہیں ہوتا ہے۔ فی الاصل اپنے ازدواجی رشتے بغیر وہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی بیوہ ہو جانے پر بھی کلچر کے ازدواج کی کوئی راہ نہ نکلتی رہے تو وہ اپنے اندر ہی اندر گھٹ کر دم توڑنے لگتا ہے۔ ہندو آج کچھ مسلمان بھی ہے اور مسلمان، کچھ ہندو، اور وہ دونوں کچھ سکھ، عیسائی، پارسی اور کچھ اور بھی ہے۔ کیوں کہ زندگی اپنے آگے آگے ہمیشہ ملی جلی ہوتی ہے اور اس کے پیچھے ہی کہیں اٹک کر ہم گویا اپنی بجائے اپنے باپ دادا کو سانس لئے جانے پر اڑ جاتے ہیں، جو ممکن نہیں۔ ہمیں بہر حال اپنے آپ کو ہی سانس لینا ہوتا ہے۔ یا پھر شاید ہم مرے مرے ہی جئے جانا چاہتے ہوں۔ ہماری مشکل یہی ہے کہ ہم ہر نئی صورت حال میں ایک دوسرے کا گلا کاٹے بغیر زندگی کی ناگزیر سچائیوں کو قبول نہیں کرتے۔

بھائی شری رام کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ پورٹ بلیئر کی واحد صف نہ جانے کب سے اندر ہی اندر دو صفوں میں بٹتی چلی آرہی ہے، اور دوسری صف پہلی کو آگے بڑھنے سے بہ زور روک لینا چاہتی ہے، اور یوں راہگیروں کی قابل لحاظ تعداد چلتی سڑک پر رک کر رہ گئی ہے اور ٹریفک میں خلل واقع ہونے لگا ہے۔



کسے معلوم تھا کہ اتنی سی بات پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا؟

پنڈت چکرورتی آج لکھنؤ سے پورٹ بلیئر آ پہنچا ہے۔ سیٹھ گردھر اور پنڈت تلسی دھر اور ایشر سنگھ اور اُن کے بیسیوں ساتھی اُسے جہاز سے اترتے دیکھ کر ہر ہر مہادیو کے نعرے بلند کرنے لگے ہیں۔ سیٹھ گردھر نے اپنی ایک ہندو، سنستھا ستھاپت کر رکھی ہے۔ جس نے پنڈت چکرورتی کو آگے پیچھے جلوس کی بھیڑ میں چار گھوڑوں کے رتھ میں بٹھا کر گوروشالہ کی عمارت میں لا اتارا ہے۔ اُس نے اگلے دن اتوار کی صبح کو اپنے بھاشن دینا ہے۔ سیٹھ گردھر نے ہدایت کر رکھی ہے کہ آج کا دن پنڈت چکرورتی کو پورا آرام کرنے دیا جائے اور اُنہیں کوئی کسی بھی باعث پریشان نہ کرے۔

آریہ سماج کے میدان میں اتنے زیادہ لوگ کبھی جمع نہ ہوئے تھے۔ اِس مجمع میں پنڈت کو سننے کے لئے سیٹھ گردھر کے حلیف بھی ہیں اور حریف بھی، اور اِن دونوں کے علاوہ بھی، جنہیں اِک ذرا سا تجسس سا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ علی اور اُس کے لوکل بارنز ساتھی بھی حاضرین میں پنڈت کے بھاشن کے منتظر بیٹھے ہیں۔ نہیں، بھائی شری رام نہیں آیا ہے، بس دھرت راشٹر کی طرح اپنے گھر بیٹھے بھاشن پر ذہن ادھر کئے ہوئے ہے اور اپنے آپ کو سمجھا رہا ہے کہ اِس بلا کے ٹل جانے کے بعد کیا کرنا مناسب رہے گا۔

پنڈت چکرورتی نے اپنے بھاشن کے لئے کھڑے ہوتے ہی ہندوؤں کو اشتعال دلانے کے لئے تاریخ کے صفحوں سے مسلمانوں کے مظالم دہرانا شروع کر دیا ہے۔ جنہیں چار پانچ منٹ سننے کے بعد علی اچانک اٹھ کھڑا ہوا ہے اور پنڈت کو روک کر بہ آواز بلند اُس سے پوچھنے لگتا ہے، کیا آپ اِس وقت تاریخ کے پنّوں میں سانس لے رہے ہیں، یا بیسویں صدی کے خاتمے پر یہاں پورٹ بلیئر میں؟ ۔آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟ —— فرقہ وارانہ فساد؟ —— مارا پیٹی؟ —— وحشیانہ قوت؟ —— کیا؟ —— کیا چاہتے ہیں آپ؟ —— ہماری جانیں؟ —— دوسری طرف سے نعرہ اٹھا ہے —— ہر ہر مہادیو! —— اور پنڈت کے حلیف اپنی جگہوں سے علی کی جانب دوڑے ہیں جس پر لوکل بارنز علی کی ڈھال بن کر اُس کے اردگرد کھڑے ہو گئے ہیں۔

میدان میں چاروں اور مردوں، عورتوں اور بچوں میں چیخ پکار مچ گئی ہے۔ ہاتھا پائی ہونے لگی ہے اور جو لوگ ہاتھا پائی کرنے والوں کو چھڑا رہے ہیں وہ بھی اِس یا اُس گروہ کی حمایت میں لڑنے لگے ہیں —— اور پولس بندوبست سے سپاہی لاٹھیاں لئے ادھر اُدھر بکھر گئے ہیں اور حالات کو اور بھی بگڑتے ہوئے پا کر پولس انسپکٹر نے اپنا پستول کھول لیا ہے اور فائرنگ شروع کر دی ہے اور اسٹیج کے قریب ہی گردھر کا ایک ساتھی گولی سے ڈھیر ہو گیا ہے اور —— بالآخر فساد پر قابو پا لیا گیا ہے۔

پولس نے علی اور اُس کے چند لوکل پارٹنرز کے ساتھ سیٹھ گردھر کے بعض لوگوں کو بھی حراست میں لے لیا ہے۔ لالو بابا اور جالم سنگھ اور بیکل سنگھ اور مولوی منظور اور پِٹ سن اور اُس کی بیوی شِشی اور —— اور سُوا ایک ٹک علی کو ہتھکڑی میں بندھا دیکھے جا رہے ہیں۔ لالو بابا نے علی کی طرف بڑھنا چاہا مگر پِٹ سن نے بڑی نرمی سے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے۔

پنڈت چکرورتی کو واپس گوروشالہ پہنچانے کے لئے گاڑی میں بٹھا دیا گیا ہے۔ پنڈت تلسی دھر اور سیٹھ گردھر بدستور اسٹیج پر بیٹھے ارد گرد کو آنکھوں میں بسائے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو بتا رہے ہیں کہ کیسا گھور کلجگ آ گیا ہے۔ پنڈت نے سیٹھ کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا ہے۔ ''مگر ہم یہ پرستتی نہیں بنی رہنے دیں گے۔ دیکھتے جاؤ سیٹھ گردھر، ہمارا ست یگ مونچھوں کو تاؤ دیتے لوٹ آئے گا۔''

طوفان جونہی تھما ہے، لاش کو اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔ اور ملزمین کو حوالات میں، اور سبھی اشخاص ایک دوسرے کو اپنی ہی سناتے اور کوئی کسی کی بھی نہ سنتے ہوئے واپس گھروں کو ہو لئے ہیں اور بچے کھچے پولس کے آدمی بھی اپنی تفتیشی کارروائی پوری کر کے واپسی کی تیاری کر رہے ہیں۔

اور لالو بابا جالم سنگھ کے پہلو میں نشان فجائیہ سا بن کر ساکت کھڑا ہے، نا معلوم آخری بار وہ کب رویا تھا، شاید کبھی نہیں رویا تھا مگر اب اُس کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو بھرے ہوئے ہیں اور ذہن میں سوچیں ہی سوچیں، جو آپ ہی اپنے آپ کو سوچے جا رہی ہیں —نہیں، لالو بابا کو نہیں معلوم، وہ کیا سوچ رہا ہے؟۔

(۹)

علی کا کیس لمبا اور پیچیدہ ہو کر آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا ہے، پولس نے اپنی تفتیش کے بعد دعویٰ کیا ہے کہ پنڈت چکرورتی کے جلسے میں اُن کی گولی سے موت واقع نہ ہوئی تھی، بلکہ یہ کام علی کی سرکردگی میں لوکل بارنز ایسوسی ایشن کے امر سنگھ یا کسی اور رکن نے انجام دیا ہے۔ وہ شہادتیں اکٹھی کر رہے ہیں، اور چونکہ سبھی حالات علی کو عین مرکز میں کھڑا رکھے ہوئے ہیں، اس لئے عدالت کے حتمی فیصلے سے پہلے اُس کی ضمانتی رہائی کا بھی کوئی امکان نہیں۔

لالو بابا اور گوراں چاچی کی اندوہ ناک حالت دیکھی نہیں جاتی ہے۔ جالم سنگھ اپنا بیشتر وقت قصوں والی گلی میں بابا اور چاچی کے ساتھ ہی گزارتا ہے۔ سُو بھی اپنے ٹھکانے سے یہاں اُنہی کے پاس رہنے لگی ہے اور اپنا کام وام ایک طرف ڈال کر اُن کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہے۔ بیکل سنگھ اپنی دُکان کھولنے جاتا ہے مگر جتنا وقت وہاں گزارتا ہے اُسے کھٹکا سا لگا رہتا ہے کہ گھر میں کچھ ہو نہ گیا ہو، اور تو اور واؤں بھی گونگی بڑھیا کے کام جلدی جلدی فارغ ہو کر بابا اور چاچی کے قدموں میں آ بیٹھتا ہے۔ بلو نے چاچی سے گھر کا سارا کام اپنے اوپر لے لیا ہے۔ بابا اور چاچی کو معلوم ہی نہیں وہ



آپس میں علی کی کیا کیا باتیں کر کے آخر میں سر لٹکا کر چپ سادھ لیتے ہیں اور پھر سر اٹھاتے ہیں تو آنکھیں ملنے پر اپنے آنسو نہیں روک سکتے۔

''میں تم سے کہا کرتی تھی نا، بابا، اُسے بھی بیکل کے ساتھ دکان پر لگا دو۔'' وہ پلو سے آنکھیں پونچھ کر بولنے لگتی ہے، مگر تمہارے سر پر ہمیشہ اُسے پڑھانے لکھانے کا بھوت سوار رہا۔ بھوت ہی تو ہوتے ہیں جو ہمیں گھر کے راستے سے بھٹکائے رکھتے ہیں۔ تم کہتے تھے، سوچ والا لڑکا ہے، بہت دور جائے گا۔ جاؤ، اب اُس کے پیچھے دور دور اُسے ڈھونڈتے رہو۔ جاؤ بابا، میرے بیٹے کو ڈھونڈ لاؤ۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

''واؤں!''۔ واؤں اُس سے کہتا ہے۔ ''صبر کرو چاچی۔''

''صبر کرنے کو کہتا ہے واہوں، تو یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اپنی گونگی بڑھیا کے پاس جا بیٹھو''۔

''واہوں! —— میں وہاں بھی یہی کہوں گا، صبر کرو۔''

پٹ سن نے علی کے ڈیفنس کے لئے ایک وکیل لگا رکھا ہے اور خود بھی قانون کی کتابوں کا مطالعہ کر کر کے کیس کے ہر پہلو میں وکیل کی مدد کیا کرتا ہے، مگر اُس کی رائے ہے کہ پولس اتنی ہوشیاری سے کیس کے اجزاء کو یکجا کر رہی ہے کہ علی کی قانونی پوزیشن روز بروز اور نازک ہوتی جا رہی ہے اور کیس ایک ایسی صورت اختیار کئے جا رہا ہے گویا علی اور لوکل بارنز کے بعض اراکین پنڈت چکرورتی کے جلسے میں صرف بھگڈر پیدا کرنے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اُن کی نیت تو یہ بھی تھی کہ سیٹھ گردھر، پنڈت تلسی دھر اور پنڈت چکرورتی کو بھی گولی مار کر فرار ہو جائیں۔

پٹ سن نے کئی بار جیل میں علی سے ملاقات کر کے اُسے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ کورٹ میں اِس دعوے کی تردید کرے کہ اُسے سیٹھ گردھر اور پنڈت تلسی دھر وغیرہ کے سارے گروپ سے نفرت ہے اور اِس بنا پر اپنے دفاع کو مضبوط کرنے میں مدد کرے کہ وہ اُنہیں مارنے کی سازش کیوں کرے گا، مگر علی کا اصرار ہے کہ اُسے اِن

لوگوں سے شدید نفرت ہے، تاہم اپنی نفرت کے باوجود وہ اُنہیں کیوں مارے گا؟ وہ اُن سے کھلے بندوں نفرت کرتا رہے گا اور لوگوں کو بھی اُن سے نفرت کی تلقین کرتا رہے گا۔

پٹ سن اور لالو بابا اِسی دوران بھائی شری رام کو بھی علی سے ملوانے لے گئے ہیں۔ بھائی نے اُس سے یہی کہا ہے، دیکھو، علی بیٹا، پٹ سن صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی بھی یہی ہدایت ہے کہ دشمن سے نفرت مت کرو۔ دشمن سے بھی محبت کرتے ہوئے اُس سے لڑو۔

بھائی شری رام کو سن کر اتنی افسوسناک حالت میں بھی پٹ سن کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی ہے۔

علی نے بھائی سری رام کو جواب دیا ہے، میں مہاتما گاندھی نہیں ہوں بھائی، کہ نفرت کرتے ہوئے محبت کئے جاؤں۔

بھائی نے اُسے سمجھانے کے لئے وضاحت کی ہے۔ ''سچائی کی راہ لگنے میں ضرور ناٹکیہ لگتی ہے بیٹے، پر ناٹکیہ ہوتی نہیں۔ میرا صرف یہ کہنا ہے، تم نے یا تمہارے کسی ساتھی نے گولی تو نہیں چلائی، مگر تمہارے نفرت کے اقرار سے عدالت دھوکا کھا سکتی ہے۔ صرف نفرت کی حالت میں ہی تو ہم کسی کو مارنے کے لئے ہتھیار اٹھاتے ہیں۔''

''مگر بھائی، میں نفرت کرتے ہوئے ہتھیار نہیں اٹھاتا۔''

علی کے وشواش سے متاثر ہو کر بھائی شری رام بھی لمحاتی طور پر سوچ میں پڑ گیا ہے کہ گاندھی نے کہیں غلط تو نہیں سوچا تھا، مگر اُس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو سمجھایا ہے کہ مہاتما گاندھی کیوں کر غلط ہو سکتا ہے، میں ہی اُسے سمجھنے میں غلطی کر رہا ہوں۔

سُو بھی علی کو کئی بار اکیلے میں مل چکی ہے۔ اُس کا محبوب اپنی ثابت قدمی کے باعث اُس کی نظر میں اور بھی اونچا ہو گیا ہے مگر اپنے محبوب کے اپنے آدرشوں میں ڈوب ڈوب کر اوجھل ہو جانے پر بھی اُس کے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔

''تمہاری کھو کھلے بندھن والی بات غلط نہ تھی سُو۔'' علی نے یاد کر کے کہا ہے۔ ''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بیوی اور بہو بننا دل سے ہوتا ہے، اِسی لئے شادی سے

پہلے ہی بہو بن کر ہمارے گھر آ گئی ہو۔''

''ہاں، علی، تمہارے ماں باپ میرے ہی ماں باپ تو ہیں۔تم اُن کی بالکل چنتا مت کرو۔''

اور علی کی ماں؟

علی کی ماں نے کہا ہے، میں اُس سے ملنے نہیں جاؤں گی، میں اپنے نیک بیٹے کو سلاخوں کے پیچھے ہتھکڑی میں بندھے نہیں دیکھ سکتی۔ جاؤ، تم سب اُس سے مل آؤ اور میری آشیرواد دے آؤ—— جاؤ!——

''ماں!'' علی نے اُسے جواب بھیجا ہے۔''ماں تم تو ہمیشہ میرے ساتھ ہو۔اپنا خیال رکھو ماں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں!—— سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ غلط نہیں ہوا۔''

مگر ماں کو یقین ہے کہ سب کچھ غلط ہوا ہے۔

''کوئی بات نہیں، ماں، غلط بھی ہوا ہے تو اللہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا۔تم میری بہادر ماں ہو، ماں، میرا اللہ سدا تمہاری حفاظت کرے گا۔خوش رہو، ماں، ہمیشہ خوش رہو!۔شتی ماں کو کیوں نہیں دیکھتیں؟ وہ کتنی حوصلہ مند ہے۔تم بھی حوصلے سے کام لو——''

اور لوکل بارنز ایسوسی ایشن؟ اُس کے ممبر بار بار میٹنگیں کر کے علی اور امر سنگھ کے دفاع کی تدبیریں کرنے میں مصروف ہیں۔سرکار کو عوام کی طرف سے اپیلیں اور پٹیشن بھیجے جا رہے ہیں۔ جلسے کر کے عوام کو سمجھایا جا رہا ہے اور ایسوسی ایشن کے کارندوں کو سن سن کر اور بھائی شری رام کے بھاشنوں سے پر بھاوت ہو ہو کر اُن میں سے جو لوگ گمراہ ہو گئے تھے وہ بھی پہلے کی مانند اُن سے آن ملے ہیں۔

پنڈت چکرورتی واپس لکھنؤ جا چکا ہے اور گردھر سیٹھ، ایشر سنگھ اور پنڈت تلسی دھر اور مین لینڈ سے آ کر بسے ہوئے لوگ اکیلے پڑ گئے ہیں۔

مگر پولس اپنے اِس دعوے پر بدستور اڑی ہوئی ہے کہ گردھر سیٹھ کا آدمی

پولس کی گولی سے نہیں مرا۔ اِس سازش میں علی اور اُس کے ساتھی شامل ہیں۔ انہوں نے پانچ چھ ماہ کی عدالتی پیشیوں میں پکی قانونی شہادتوں کی مدد سے آخر ثابت کر دیا ہے کہ علی کی شہ پر امر سنگھ نے گولی چلائی تھی اور یہ سارا فساد علی کی سرکردگی میں بپا کیا گیا تھا۔ علی اور امر سنگھ کے سوا سبھی ملزمین کو بری کر دیا گیا ہے۔ علی اور امر سنگھ کو عمر قید کی سزا ہو گئی ہے۔ مزید، پورٹ بلیئر کے امن عامہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے عدالت نے اپنے فیصلے میں شامل کیا ہے کہ علی اور امر سنگھ کو بمبئی جیل میں رکھا جائے۔

(۱۰)

ساری اپیلیں لاحاصل ثابت ہوئی ہیں اور علی اور امر سنگھ کو آج بمبئی جیل کیلئے روانہ کر دیا گیا ہے۔

لالو بابا کو اتنے ماہ بعد پہلی دفعہ واضح طور پر احساس ہے کہ اُس پر کیا بیت گئی ہے اور اُس احساس کی جلن سے اُس کی آنکھوں میں سیلاب پھوٹ آیا ہے۔

سُو اپنی جگہ سے اُٹھ کر اُس کے قریب آ بیٹھی ہے اور اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ''میں ہوں نا، بابا۔''

ہاں، بیٹا اب تم ہی تو ہو۔'' بابا نے اپنی ہچکیوں کو دبا کر کہا ہے۔ ''وہ تو کالے پانی چلا گیا ہے۔ وہاں کے لوگ تو بڑے ظالم ہوتے ہیں بیٹا، کیسے کاٹے گا؟''

جالم سنگھ بھی اُس کے پاس آ کھڑا ہوا ہے۔ ''پھکر مت کرو بابا، میں نے اپنے واہگورو کو بھی اُس کے ساتھ سجا کاٹنے بھیج دیا ہے۔'' اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بابا کی ڈھارس کیسے بندھائے۔ ''میں نے واہگورو سے کہا اے بابا، مجھے اب چھوڑ دو، اب ہمارے بچے کو سنبھالو۔'' وہ رونے لگا ہے۔ ''تم بھی کُھل کے رو لو بابا۔ اپنے دُکھ سنبھال کے نئیں رکھو۔ تم بھی، سُو بیٹا ــ سب کے سب سارا رونا آج ہی رو لو ــ اوئے! ــ میری بہن کدّھر گئی اے؟ ــ اوئے واہوں، جاؤ، دیکھو، اوس پگلی نے کچھ کر نہ لیا ہو، ــ''

پس لفظ

بابا



کہنے کو اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ پِٹ سن صاحب۔ ساری کہانی تو ہو لی ہے۔

نہیں، میں نے شاید غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ اگر واقعی ہو لی ہے، پِٹ سن صاحب، تو میں اُس کی پرچھائیوں میں کیوں گھرا رہتا ہوں؟

نہیں، دُکھ کا بھی کوئی انت ہے؟ پوری تو صرف بَٹی ہوئی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ آئیں اور وہ گئیں، جیسے کبھی پیش ہی نہ آئی ہوں۔ میں ساری عمر انہیں ہی بھول بھول کر یاد کرتا رہا۔

مگر جو کہانی مجھے پیش آئی ہے، اُس کی مجھے کوئی خبر نہیں۔ وہ تو بمبئی جیل میں جا کھوئی ہے۔ سب پوچھتے رہتے ہیں، کوئی خبر آئی ؟ مگر کیا پتہ، کیا ہوا؟ آپ کو کوئی پتہ چلا، پِٹ سن صاحب؟

نہیں ، مجھے کیا معلوم، بمبئی جیل کہاں ہے؟

کیا معلوم، میرا بیٹا اِس وقت کہاں کیا کر رہا ہے؟

اللہ کا نام لے کر میں جہاز میں جا بھی بیٹھوں تو راستے میں سمندر میں غوطے کھا کھا کر جان دے دوں اور اپنے علی کے پاس پہنچنے کی بجائے اگلے جہان جا پہنچوں۔

نہیں ، اگلے جہاں میں میرا کون ہے؟ میری گوراں چاچی تو یہاں ہے اور علی وہاں بمبئی جیل میں۔

بمبئی جیل کیا بہت بڑی ہے پِٹ سن صاحب؟

کیا یہاں کی طرح وہاں بھی قیدیوں کو جیل سے نکال کر شہر میں بسا دیا جاتا ہے؟

نہیں، پِٹ سن صاحب، میں اگر گھبراؤں بھی نہیں تو جیوں کیسے؟ ایک اِسی لئے تو زندہ ہوں کہ ہر دم گھبرایا رہتا ہوں۔

پہلے یہ بتایئے، بمبئی اسٹیشن پر اتر کر سب سے پہلے کون سا راستہ پکڑنا پڑتا ہے؟

آپ کو بھی یہ معلوم نہیں؟ —— تو کہیں سے پتہ لگا کے اسٹیشن سے جیل تک کے سارے راستے ایک کاغذ پر لکھ کر مجھے دے دیجئے —— نہیں، میں نکل ہی پڑوں گا۔ نہیں، مجھے کیا معلوم، اپنے بیٹے سے ملنے مجھے کہاں جانا ہے۔ سُو کو ساتھ لے لوں گا۔

سُو بڑی اچھی لڑکی ہے، پِٹ سن صاحب۔

آپ بجا کہہ رہے ہیں، میں چلا گیا تو گوراں چاچی تو میرے بغیر اُسی

دن ڈھیر ہو جائے گی۔

ہاں، آپ بجا کہہ رہے ہیں۔ جو ہولیا، اُسے یاد کئے جانے سے کیا حاصل؟ــــــ پر مجھے اب کیا حاصل کرنا ہے؟

میری کہانی تو پوری ہو لی ہے۔ مگر کہاں پوری ہوئی ہے۔ پِٹ سن صاحب؟ وہ تو بمبئی جیل میں جا کھوئی ہے، اور اُس کی پرچھائیاں مجھے یہاں گھیرے رکھتی ہیں۔

خدارا میری مدد کیجئے ــــــ خدارا پِٹ سن صاحب، جو بھی ہونا ہے وہ سارے کا سارا ایکدم ہو جانے دیجئے۔

ہاں، آپ کیا کر سکتے ہیں؟ ــــــ

ہاں، پِٹ سن صاحب، کوئی پوری کہانی بھلا کہیں پوری ہوتی ہے؟ ــــــ!

(ختم شد)

جوگندر پال کو ملے انعامات:

★ غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ (۱۹۸۳ء)

★ اردو۔ ہندی ایوارڈ، اتر پردیش کا اردو ایوارڈ (۱۹۸۳ء)

ب (۱۹۹۱ء)

ی، دہلی۔ (۱۹۹۴ء)

۔ (۱۹۹۹ء)

ن الاقوامی ایوارڈ (۲۰۰۱ء)

کا ''قرطاسِ اعزاز''

سے نیچے):

مان) کے تاریخی سیلولر جیل

جاتا۔

سات حصے تھے جنہیں ایک

جسکی ٹیک کے لئے مرکزی

لتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

ل کی سزا کا نام ہے۔

COVER : INSHA GRAPHICS